اقبالؔ کو مشاہیر ادباء و شعراء، اکابرینِ وقت اور
معاصرین کا منظوم و منثور خراجِ عقیدت
(تعزیتی نظموں اور تاثرات کا عدیم المثال انتخاب)



اقبالؔ
بہ چشمِ دل

مرتب و مصنف
خان حسنین عاقبؔ

پبلشر: ادارہ ادبِ اسلامی ہند، مہاراشٹر

اقبالؔ کو مشاہیر ادباء و شعراء، اکابرین وقت اور معاصرین کا

منظوم و منثور خراجِ عقیدت

(تعزیتی نظموں اور تاثرات کا عدیم المثال انتخاب)

اقبالؔ

بہ چشمِ دل

مرتب و مصنف

خان حسنین عاقبؔ

پبلشر : ادارہ ادبِ اسلامی ہند، مہاراشٹر

نام کتاب　: اقبالؔ، بہ چشمِ دل

مرتب ومصنف　: خان حسنین عاقبؔ /09423541874

: ٹیچرس کالونی، پوسد۔ hasnainaaqib1@gmail.com

پبلشر　: ادارہ ادبِ اسلامی ہند، مہاراشٹر، افضل باغ، آکوٹ، ضلع آکولہ۔8983449218

پرنٹر　: نورانی آفسیٹ پریس، مالیگاؤں۔

اشاعت　: ۲۰۱۵ء

تعدادِ اشاعت　: 1000 (بارِ اوّل)

قیمت　: 100 روپے

ترتیب وتہذیب　اشفاق عمر، مالیگاؤں

کتاب ملنے کے پتے

۱۔ ادارہ ادبِ اسلامی، مہاراشٹر، افضل باغ، آکوٹ، ضلع آکولہ، مہاراشٹر

۲۔ ادارہ ادبِ اسلامی ہند، ڈی 321، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، دہلی۔

۳۔ مرکزی مکتبہ اسلامی، مہاراشٹر

۴۔ سب بکڈپو، ناندیڑ

۵۔ خان حسنین عاقبؔ، علامہ اقبال ٹیچرس کالونی، مومن پورہ، واشم روڈ، پوسد، مہاراشٹر 445215

انتساب

اُن اقبالؔ شناس اور اقبالؔ فہم صاحبانِ ذوق کے نام

جن کے نزدیک اقبالؔ کی شاعری محض تفنّنِ طبع اور

خوش باشی کا ذریعہ نہیں

بلکہ

دورِ حاضر کے نشاۃ الثانیہ کی آوازِ جرس ہے۔

پیش لفظ

معاصر اردو ادب میں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسے رجحات کے دم توڑنے کے بعد کسی نئے صحت منداد بی رجحان کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں ہے لیکن ان تمام رجحانات کی ازکار رفتگی نے اصلاحی ادب کی ہمہ وقت ضرورت و اہمیت کو اظہر من الشمس کر دیا ہے۔ میرؔ، سرسید، ڈپٹی نذیر احمد، غالبؔ، حالیؔ اور اقبالؔ جیسے عہد ساز قلمکاروں کی تخلیقی بوقلمونی کے جلوے آج بھی زندہ و تابندہ ہیں۔

ان تمام اصحاب میں اقبالؔ کو اختصاص اس لئے حاصل ہے کہ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایسے وقت اپنی فکری اساس کا احساس دلایا جب ملتِ اسلامیہ زبوں حالی اور اخلاقی انحطاط سے گزر رہی تھی۔ اقبالؔ نے مسلمانوں میں جینے کا حوصلہ پیدا کیا۔ اقبالؔ کی شاعرانہ حیثیت کے علی الرغم ان کی فکری نہج نئی نسلوں کی تربیت اور اخلاقی و مذہبی قدروں کی آبیاری کی حد درجہ متحمل ہے۔ اور آج اقبالؔ کی فکر کے ابلاغ کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اس لئے کہ نئی نسل میں صالح ادبی فکر رکھنے والے قلمکار جتنی تعداد میں ہمارے درمیان ہونے چاہئیں، نہیں ہیں۔

اسی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ادارہ ادبِ اسلامی، مہاراشٹر گزشتہ گیارہ برسوں میں ریاستِ مہاراشٹر میں مختلف جگہوں پر اپنی سالانہ ادبی کانفرنسوں اور کل ہند مشاعروں کا انعقاد کر چکا ہے۔ ادارہ

کی جانب سے ہر برس شاعری اور نثر، ادب کے دونوں شعبوں میں قابل قدر خدمات انجام دینے والے مہاراشٹرا کے قلمکاروں کو بالترتیب حفیظؔ میرٹھی اوارڈ اور عصمت جاویدؔ اوارڈ نوازا جاتا ہے۔ ادارے کی جانب سے ادیبوں اور شعراء کی تخلیقی کاوشوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

اس مرتبہ بارہویں ادبی کانفرنس کا انعقاد مارچ 2016 میں طے ہے، ان شاءاللہ لیکن اس سے قبل نومبر میں یومِ اقبال کے موقعہ پر' تفہیمِ اقبالؔ' کے زیرِعنوان ایک سیمینار منعقد کیا جارہا ہے۔ اسی مناسبت سے نوجوان ادیب، مترجم وشاعر خان حسنین عاقبؔ کی مرتب کردہ کتاب 'اقبالؔ، بہ چشمِ دل' پیشِ خدمت ہے۔ اس کتاب میں حسنین عاقبؔ نے نہایت مشقت اور جانفشانی سے کام لیتے ہوئے اقبالؔ کی شخصیت اور فن سے متعلق مشاہیر ادباء وشعرا،، اکابرین وقت اور معاصرین ومتاخرین کی منظوم ومنثور آراء اور خراجِ عقیدت کو جمع کردیا ہے۔ یہ مجموعہ اپنے مواد کی وجہ سے عدیم المثال ٹھہرتا ہے۔ حسنین عاقبؔ نے علامہ اقبالؔ سے اپنے روحانی تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے دو نہایت اہم مقالوں کو اس کتاب میں شامل کرکے کتاب کی اہمیت میں اضافہ کردیا ہے۔

امید ہے یہ کوشش آپ کے صالح ادبی ذوق کی تسکین اور فکرِ اقبالؔ کی تفہیم کا سامان فراہم کرے گی۔

محمد ابراہیم خان

صدر، ادارہ ادبِ اسلامی ہند

(مہاراشٹر)

بسم اللہ

اقبال کا ایک عاشق زار۔خان حسنین عاقبؔ

پروفیسر احمد سجاد

اقبالیات کے بعض محققوں نے اقبالؔ کے لڑکپن کا یہ مشہور واقعہ نقل کیا ہے کہ موصوف بچپن سے قرآن کریم کی تلاوت کے عادی تھے۔ایک روز ان کے والد بزرگوار نے ان کی تلاوت کے بعد یہ فرمایا کہ چند برسوں کے بعد جب تم فلاں امتحان پاس کرلو گے تو تمہیں ایک خاص بات بتاؤں گا۔ چنانچہ کئی برس انتظار کی بے کلی میں گذار کے اس امتحان کو پاس کرلیا تو ان کی یاد دہانی پر ان کے والد بزرگوار نے فرمایا کہ ''قرآن پاک کی تلاوت اس طرح کرو کہ جیسے یہ آیات تم پر براہ راست نازل ہو رہی ہیں''۔

اس نصیحت پر عمل نے اقبالؔ کی پوری زندگی کو ایک انقلابی موڑ سے ہمکنار کردیا اور ''مردمومن'' کا ایسا قرآنی تصور پیش کیا جو بقول زیرِ مطالعہ کتاب 'اقبالؔ، بہ چشمِ دِل' کے مصنف خان حسنین عاقبؔ، حقیقی مردمومن کے لیے 'ایمان کے تین اجزاء یعنی ''قرآن، عشق محمدؐ اور شریعت'' کا مکمل طور سے' حامل ہونا لازمی ہے۔

؎ گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

کیونکہ ؎ آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ او، لازوال است و قدیم

اسی طرح کا ایک خوشگوار واقعہ مصنف کے ساتھ ہوا، جس کی تفصیل انہوں نے کتاب میں شامل اپنے ابتدائی مضمون میں ''اقبالؔ اور میں'' کے زیرعنوان پیش کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ مصنف (خان حسنین عاقبؔ) کے دادا اور والد بزرگوار کا شمار عاشقان اقبالؔ میں ہوتا تھا اس لیے

ایک تقریب ''یومِ اقبالؒ'' میں جب مصنف کی عمر بمشکل ۷۔۸ برس کی تھی۔ان کے بزرگوں کی فرمائش پر''مولانا ظفر علی خاں کی تحریر کردہ تعزیتی نظم'' گھر گھر تھا یہی چرچا کہ اقبال کا مرنا۔اسلام کے سر پر ہے قیامت کا گزرنا'' پیش کیا تو انہیں تیسرے انعام کا حقدار قرار دیا گیا''۔یہیں سے ان کے اقبالؒ سے اعلانیہ تعارف و تعلق کا سلسلہ شروع ہوا۔مگر انہیں برسہابرس تک یہ بات کھٹکتی رہی کہ انہیں اول کے بجائے تیسرے انعام کا مستحق کیوں قرار دیا گیا۔جوانی میں شعری ذوق بیدار ہوا تو 'اقبالیہ' طرز اسلوب سے متاثر رہے۔پھر اس اسلوب سے کنارہ کش ہو کر اپنی منفرد راہ اختیار کی۔مگر بیسیوں برس تک اقبالؒ پر فرمائش کے باوجود کچھ لکھنے سے کتراتے رہے۔یہاں تک کہ ایک روز انہوں نے خواب میں اقبالؒ کو اس حال میں دیکھا کہ ان کے لبوں پر ایک دلنواز تبسم تھا۔اس خواب نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ''اب شاید وقت آگیا ہے کہ میں اقبالؒ پر کچھ لکھوں،اس کے عشق اور اپنے اسلاف کی وراثت کا حق ادا کروں''۔

مصنف بڑے خوش بخت ہیں کہ خدا نے انہیں نظم و نثر دونوں میں طبع آزمائی کی قدرت دی ہے اس لیے نظم کے علاوہ ایک مضمون بعنوان ''اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے''قلمبند کیا۔عاقبؔ چونکہ ماشآءاللہ کثیر اللسان اور اردو کے ابھرتے ہوئے شاعر بھی ہیں اس لیے اپنے خواب میں اقبالؒ کے دلآویز تبسم کو متغزلانہ زبان میں مونالیزائی اندازِ تبسم سے تعبیر کیا ہے،اسی مناسبت سے انہوں نے اس سال عاشقانِ اقبالؒ کو یومِ اقبال کے موقع پر اقبالؒ جیسی کثیر الابعاد شخصیت کی رعائیت سے ''اس کتاب نما میں ایسے اکابرینِ ملک و ملت کی آراء جمع کی ہیں جو مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھتے تھے''۔

ان سے پہلے مصنف نے اول و آخر ''اقبال بہ چشمِ دل'' اور ''اقبال اور میں'' کے زیرِ عنوان بڑے والہانہ انداز میں اپنے منظوم و منثور تاثرات کو کلامِ اقبال کے بکثرت حوالوں سے مزین کر کے پیش کیا ہے۔''بہ چشمِ دل'' کے تحت کئی صفحات میں مصنف نے اقبال کے شاعر،مفکر،مجدد،فلسفی نیز ان کے صاحبِ نظر،صاحبِ بصیرت،صاحبِ شعور،صاحبِ ادراک اور صاحبِ آگہی اور آوازِ جرس کا تذکرہ

کرتے ہوئے ان کی پیمبرانہ شاعری، قلندری، درویشی، بے نیازی، غزالی ورومی سے اکتساب علم روحانی اور اقبال کے فکروفن کی تقریباً تمام رنگارنگی کو ان کے اردو و فارسی کلام کے برمحل اشعار سے اجاگر کردیا ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے تقریباً ۲۲ مشاہیر شعرا کے منظوم خراجِ عقیدت کو یکجا کردیا ہے۔ سب سے پہلے سیمابؔ اکبر آبادی کی نظم کا اقتباس ہے جس میں انہوں نے اقبال کو ''خداشناس، خودی کے پیامی، فلسفی مشرق عینی، حکیم ھند، کلیم ھند، راز دار سر حقیقت، جان قوم، شان قوم وغیرہ جیسے القاب وآداب سے یاد کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ؎

جب قوم کے عروج کا پھر دور آئے گا کوشش میں تیرا نام بہر طور آئے گا

مولانا ظفر علی خاں کے تعزیتی اشعار میں اقبال کے تخیّل کے فسوں نے سو سال کے سوئے ہوئے جذبوں کو جس طرح ابھارا اور مسلمانوں کو مسلسل یہ درس دیا کہ وہ بجز اللہ کسی سے نہ ڈریں کا تذکرہ کرکے ملت کو نئی زندگی دینے کا بھی اقرار کیا ہے۔

مولانا ماہر القادری کی نظم میں اقبال کے مختلف مجموعہ ہائے کلام کی اہمیت ومعنویت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے خیال میں ؎

کارواں خواب میں تھا بانگ درا سے پہلے

اقبال نے ''بال جبریل'' کے سائے میں قوم کو گرم خِرام کیا، ایک نئے طرز سے ضرب کلیمی کی تو بصد ناز اللہ سے 'شکوہ' بھی کیا، بدرو حنین کی یاد تازہ کی تو تہذیب فرنگی کے صنم کو بھی توڑا اور عشق رسولؐ کی دانش سے انہوں نے فکرِ فرسودہ کو پرواز بھی عطا کی۔ ابوالاثر حفیظؔ جالندھری نے سہل ممتنع کے انداز میں جو خراج عقیدت پیش کی اس کے آخری مصرعے توجہ طلب ہیں۔ ؎

دنیا میں بڑا تھا اس کا رتبہ عقبیٰ میں دو چند ہو گیا ہے

اقبال بلند تھا ہمارا اب اور بلند ہو گیا ہے

فیض احمد فیضؔ نے اپنی نظم میں اقبال کو ایک خوش نوا فقیر سے تعبیر کیا ہے، جس کی غزل خوانی نے سنسان راہوں کو خلق سے آباد کردیا۔ شکیلؔ بدایونی نے اس انداز سے خراج عقیدت پیش کی ہے:

شاعر، ادیب، فلسفی، عارف، خدا شناس　مجموعۂ کمال تھا، اقبالؔ اٹھ گیا

اولین منظوم حصے کے بائیسویں شاعر خود خان حسنین عاقبؔ ہیں جنہوں نے چار بندوں کی آزاد نظم میں بڑے ولولہ انگیز انداز میں ڈرامائی لب و لہجے سے آغاز سخن کیا ہے:

چلو! قلم کو عبادتوں کا مزہ چکھائیں
جدید لہجے کے شاعروں کو
روایتوں کا مزہ چکھائیں
انہیں بتائیں اسی افق پر
شہِ سخن بھی براجماں تھا

آگے کے اشعار میں اقبال کے شاندار کارناموں اور خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے، ان کی شان میں حقیقی خراج عقیدت کا یہ انداز تمام ہوا:

چلو کہ تبدیلیوں کی ایسی ہوا چلائیں
کہ عشق بیز و خیال آور ہوں یہ فضائیں
ہر ایک مسلم جوان اقبالؔ کا اگر ہم مزاج ہوگا
اسے ہمارا یہی حقیقی خراج ہو گا

اس کے بعد اس معنی خیز کتاب کا نثری حصہ "خراج عقیدت" "تاثرات اکابرین وقت" کے زیر عنوان شروع ہوتا ہے۔ جس کے کئی ذیلی عنوانات بنائے گئے ہیں۔ مثلاً

(ا)　اقبال! بہ چشم سیاست کے ذیل میں سب سے پہلے موہن داس کرم چند گاندھی کے تاثرات پیش کیے گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے تعزیتی پیغام مع دستخط بزبان اردو یہ تحریر کیا کہ:

"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جب ان کی نظم "ہندوستان ہمارا" پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور یروڈا جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے۔ اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی

ہے"۔(موہن داس کرم چند گاندھی　۹/جون ۱۹۳۸ء)

محمد علی جناح نے اقبال سے اپنی ہم آہنگی اور تقویت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ:

"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں نے ان سے زیادہ وفادار رفیق اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور وہی ایک عظیم اور اہم مسلمان تھے"

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے ان کی وفات پر لکھا کہ:

وہ"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اپنی وفات سے ہمارے ادب میں ایسی جگہ خالی کر گئے۔جس کا گھاؤ مدت مدید تک مندمل نہیں ہوسکتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہم کسی حالت میں ایسے شاعر کی کمی برداشت نہیں کر سکتے۔جن کے کلام نے عالمگیر مقبولیت حاصل کر لی تھی"۔

ڈاکٹر سر اکبر حیدری، صدر اعظم حکومت دولت آصفیہ نے لکھا:

"اقبالؔ نے ساری دنیا کے لیے ایک نیا پیام دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اسی طرح سر تیج بہادر سپرو اور ڈاکٹر راجندر پرساد (پہلے صدر جمہوریہ ہند) نے یکے بعد دیگرے ان کی"دقت خیال اور وسعت نظری، نیز ان کے"اشعار نے ہندوستان میں نئی روح پھونک دی۔۔۔۔۔۔۔۔"جیسے الفاظ سے یاد کیا۔

(۲)　"اقبال بہ چشم مذہب" کے ذیل میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، عبدالماجد دریابادی، مولانا سید سلیمان ندوی ("دنیا سے اٹھ جانے کے باوجود راہنمائی اقبال سے طلب کی جائے گی") خواجہ حسن نظامی (جسم پنجابی، دماغ فلسفی، خیال صوفی، دل مسلمان) نیز مولانا ابوالحسن علی ندوی، نعیم صدیقی، مریم جمیلہ (اقبال کی اسرار خودی کے انگریزی ترجمے کے باوجود میں نے اسے مسحور کن پایا)

(۳)　"اقبال بہ چشم احباب" کے ذیل میں، فقیر سید وحید الدین (ان کی زندگی ایک صابر اور متوکل مسلمان کی زندگی اور ان کا عمل ان کی فکر و نظر کا نمونہ تھا) سید عطاء اللہ شاہ بخاری (اقبال جدید دانش اور قدیم حکمت کا نقطۂ عروج)، بابائے اردو مولوی عبدالحق، غلام رسول مہر، سید نذیر نیازی،

عبدالمجید سالک کے مختصر تاثرات کے بعد

(۴)　''اقبال بہ چشم معاصرین ومتاخرین (ادب وفن) کے ذیل میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری (غم دوراں کا ایسا نوحہ خواں اور عظمت انساں کا ایسا قصیدہ خواں بیسویں صدی میں کوئی شاعر نہیں ہوا) ڈاکٹر جاوید اقبال، قدرت اللہ شہاب، شمس الرحمٰن فاروقی، رشید احمد صدیقی، این میری شمل (مشہور جرمن ماہر اقبالیات) (مذہب کی تاریخ میں جسے پیغمبرانہ انداز کا تجربہ کیا جاتا ہے اقبال اس کی بہترین مثال تھے) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، فیض احمد فیض (جہاں تک شاعری میں حساسیت، زبان پر عبور اور غنائیت کا تعلق ہے ہم تو ان (اقبال) کی خاک پا بھی نہیں)، شورش کاشمیری، عرفان صدیقی، سید اقبال عظیم، ہارون رشید، جاوید ہاشمی وغیرہ کے بیش بہا تاثرات پر یہ باب اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یوں مصنف خان حسنین عاقبؔ نے اس چھوٹی سی کتاب میں یوم اقبالؔ کی مناسبت سے کتاب کے سرورق پر جو دعویٰ کیا اسے انتھک محنت اور بڑے موثر انداز میں عملی جامہ پہنا کے دکھا دیا۔ یعنی اقبال کو مشاہیر ادباء وشعراء، اکابرین وقت اور معاصرین کا منظوم ومنثور خراج عقیدت (تعزیتی نظموں اور تاثرات کا عدیم المثال انتخاب)۔

خزینۂ اقبالیات میں اس انوکھی اور عدیم النظیر کتاب کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ مصنف کو دلی مبارکباد

احمد سجاد
سابق ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹز
اور پروفیسر صدر شعبہ اردو
رانچی یونیورسٹی رانچی، جھارکھنڈ۔

اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ

علامہ اقبال کا شمار بیسویں صدی کے عظیم شعراء میں ہوتا ہے۔ان کی شاعری کا مرکزی کردار نہ ہی فطرت ہے اور نہ ہی کوئی خوبصورت محبوبہ بلکہ حرکت وعمل کا پیکر انسان ہے۔مصنفِ کتاب خان حسین عاقبؔ کا شمار بھی بیسویں صدی کے ان بیشتر پرستارانِ اقبال میں ہوتا ہے جنھیں عہد طفولیت کے دوران ہی اقبالیات کا چسکہ لگ گیا تھا۔بچپن کا زمانہ بھی قدرے نادانی کا ہوتا ہے لیکن اشعار کے مفہوم سے نا آشنا ہونے کے باوجود گھر کا ماحول کچھ اسطرح کا تھا کہ ایک سوم جماعت کا طالب علم اقبالیات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے میں ہر طرف اقبالؔ کی شاعری کا چرچا تھا۔گھروں میں،اسکولوں میں اور جامعات میں اقبالؔ کی نظمیں بچوں اور بڑوں کی زبانوں پر تھیں۔ہر صاحب ذوق کے کتب خانہ میں اقبالؔ کے کلام کا مجموعہ موجود رہا کرتا تھا۔یقیناً عاقبؔ صاحب کا گھرانہ اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔حسنین عاقبؔ،صاحب نظر بھی ہیں اور صاحب ذوق بھی۔ان کا اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی ادب کا گہرا مطالعہ ہے۔اقبالؔ سے انہیں خاص شغف ہے۔زیر نظر کتاب میں ان کے مضامین ان کی بصیرت کا ثبوت اور مطالعہ کی گہرائی کا پتہ دیتے ہیں۔میں اس مختصر کتاب کو اقبالیات کے سرمایہ میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھتا ہوں گو کہ یہ کتاب کوئی تحقیقی کتاب نہیں ہے۔ایک ایسے شخص کی تاثراتی اور تخلیقی پیشکش ہے جسکا بچپن سے ہی اقبالؔ کا ساتھ رہا ہے اور جس نے برسہا برس اقبالؔ کی شاعری کو اپنے اندر اُترنے دیا ہے۔

اقبالؔ شاعر بھی ہے اور مفکر بھی۔وہ نہ صرف خودی کا پیغام ہے بلکہ بے خودی کا رمز شناس بھی ہے۔اقبالؔ نے اپنی شاعری سے جو کام لیا ہے اس کی مثال مسلمانوں کی شاعری کی تاریخ میں نہیں ملتی۔اقبالؔ کی اسی انفرادیت نے عاقبؔ صاحب کو اپنا عاشق بنایا۔انہوں نے اقبالؔ کی تلاش میں اقبالؔ کے فکری سرچشموں کی غواصی کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ شاعر اقبالؔ اور دانشور اقبالؔ کے درمیان کوئی فصل نہیں بلکہ ایک تحقیقی وحدت ہے۔کلام اقبالؔ میں مذہبی سرچشموں کے ساتھ ساتھ تہذیب وتمدن کی رعنائیاں

بھی ہیں اور قوموں کا عروج وزوال بھی ہے۔تاریخ کے دھارے بھی ہیں۔عصرِ نو کی تحریکیں بھی ہیں اور فکر ودانش کی شمعیں بھی۔سائنس کے تجربات کے ساتھ ساتھ فلسفوں کی کشاکش بھی ہے اور کھوئے ہوؤں کی جستجو بھی ہے۔ایسے راسخ العلم شخص کا یہ کہنا کہ ''اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے'' ایک نرالا انداز بیان ہے۔گو اقبالؔ کے پرستار بعض وقت افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔والہانہ عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہیں۔ترجمانِ حقیقت کا یہ فرمان ہے کہ

گر تو میخواہی مسلماں زیستن　　　نیست ممکن جز بقرآن زیستن

مصنف کتاب نے اقبال کے دوقومی نظریہ کی حقیقت پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔بعض ناقدین نے کہا کہ اقبالؔ کے جذبہ وطن پرستی پر ان کی اسلام دوستی غالب آگئی تھی۔وہ اس نکتہ کو فراموش کر جاتے ہیں کہ اسلام کا عقیدہ واعمال کی پاسداری میں اقبالؔ کے ہاں کہیں بھی حب الوطنی سے بے نیازی ظاہر نہیں ہوتی۔بنیادی طور پر اقبالؔ ایک ایسے بین لاقوامی نظام کی تمنا رکھتے تھے جو اخوات اور اتحادِ بشری، ہم آہنگی اور قوموں کے باہمی امن وآشتی پر استوار ہو اور جس میں عظمت اِنسان کا بول بالا ہو۔جہاں اخوت کی فراوانی اور محبت کی عالمگیریت ہو۔یہی وہ مقام ہے جہاں وہ آفاقی قدروں کے ترجمان بن جاتے ہیں۔اقبالؔ نے ہندوستان کے عہدِ جدید کی تاریخ کے دو غدّاروں یعنی بنگال کے میر جعفر اور دکن کے میر صادق پر لعنت بھیجی ہے، اول نے سراج الدولہ سے اور دوسرے نے ٹیپو سلطان کے ساتھ غداری کی تھی۔

اقبالؔ کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔لکھا جارہا ہے اور لکھا جاتا رہیگا۔وقت گذرتا جائیگا اور سوچنے والے ذہن اپنے نئے انداز سے فکر اقبالؔ پر روشنی ڈالتے رہیں گے۔میں عاقبؔ صاحب کے اس کارنامے کو جو ''اقبال بچشمِ دل'' کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آرہا ہے ایک بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں۔اس کی توصیف وتحسین دل کی گہرائیوں سے کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ضیاء الدین نیرؔ

نائب صدر

اقبال اکیڈمی انڈیا (حیدرآباد)

اقبالؒ اور مَیں ۔۔۔

خان حسنین عاقبؔ

اقبالؒ سے میرا کوئی گہرا تعلق ضرور ہے۔لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ تعلق کیا ہے؟ جب میں اپنی طالبِ علمی کے دور سے گزر رہا تھا، بلکہ زیادہ درست امر تو یہ ہے کہ میں اپنے بچپن اور لڑکپن، دونوں کی درمیانی دہلیز پر تھا، اسی وقت اقبالؒ سے میرے مراسم کا آغاز ہو چکا تھا۔اسی دوران اقبال کی شاعری مجھے گھٹی میں پلائی گئی تھی۔میرے والدِ محترم اور دادا حضرت، اقبالؒ کے عاشق زار تھے۔اقبالؒ نے مجھے بھی نصیحت کی کہ ؎

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو؟

لہٰذا اقبالؒ سے عشق مجھے وراثت میں مل گیا۔میرا اقبالؒ سے وہ تعلق پیدا ہو گیا جو اقبالؒ کو اپنے مرشدِ رومیؒ سے تھا۔اسی تعلق نے میرا رشتہ اقبالؒ سے ایسا استوار کیا کہ میں اقبالؒ کی تنقیص میں کچھ ستم ظریف لوگوں کی کتابیں پڑھ کر بھی اپنے دل سے اس کی محبت کو کھرچ کر مٹا نہیں پایا۔میں سوم جماعت میں زیرِ تعلیم تھا۔یہ شائد پورے برِ صغیر میں اقبال صدی کی تقاریب کا موسم تھا لہٰذا ہمارے شہر آکولہ میں بھی اقبالؒ صدی کی تقریب اس برس بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔میرے والد صاحب نے مجھے بھی حکم دیا کہ میں بھی اس عظیم الشان پروگرام میں حصہ لوں۔والد صاحب کا حکم، حکم نہیں فیصلہ ہوا کرتا تھا اور اپنے ہر فیصلے کی قوتِ نفاذ کی اہلیت بھی ان میں بدرجۂ اَتم موجود تھی اور آج بھی ہے۔اور پھر سات آٹھ برس کی عمر میں میری مرضی ہی کیا؟ اگر بات والد صاحب کے حکم کی کریں تو آج اپنی طبعی عمر کی نصف صدی پار کرنے سے صرف پانچ برس پیچھے ہونے کے باوجود میں ان کے

حکم سے سرتابی کی جرات نہیں پاتا۔ بہر کیف، تو اُس معصوم سی عمر میں اقبالؔ صدی کے جلسہ میں میں نے حصہ لیا، تقریر بھی کی اور اقبالؔ کے انتقال پر مولانا ظفر علی خان کی تحریر کردہ تعزیتی نظم 'گھر گھر تھا یہی چرچا کہ اقبالؔ کا مرنا۔۔۔اسلام کے سر پر ہے قیامت کا گزرنا' بھی پڑھی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں تیسرے انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ کچھ نقد، کچھ کتابیں اور ایک قلم بطورِ انعام دیا گیا۔ نقد تو اگلے دن چاکلیٹ اور برفی والے کے خزانے میں جمع ہوگیا کہ دس بیس روپئے کی بساط ہی کیا تھی؟ کتابیں ایسی تھیں کہ ان کا مواد تیسری جماعت کے بچے کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ لیکن وہ قلم میرے پاس ایک طویل عرصے تک رہا۔ وہ اقبالؔ سے میرے اعلانیہ تعارف اور تعلق کا بیعانہ تھا۔

شائد اسی تیسرے انعام نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا ہوگا کہ پہلا یا دوسرا انعام کیوں نہیں ملا۔ لیکن اس سوچ کا آغاز اسی وقت نہیں ہوا کیوں کہ عمر اتنی بڑی بات سوچنے کی اجازت دینے کی متحمل نہ تھی۔ اس کے بعد بچپن بھر میں اقبالؔ کی نظمیں رٹتا رہا، دہراتا رہا، گنگناتا رہا۔ پھر شعور نے اقبالؔ کے علاوہ دیگر شعراء سے بھی متعارف کروایا۔ عمر کے لحاظ سے ترجیحات بدلتی گئیں۔ جوان ہوا تو میں نے خود کو شاعر کے روپ میں دیکھا۔ تب بھی اقبالؔ سے پیچھا نہیں چھوٹا تھا۔ لیکن ایک فاصلہ ضرور پیدا ہوگیا تھا۔ شاعری کی تو ابتداء میں اقبال سے متاثر ہوکر کہنا شروع کیا لیکن جلد ہی 'اقبالیہ' طرز و اسلوب سے کنارہ کشی اختیار کرکے اپنا الگ رنگ طے کرلیا۔ دو دہائیاں گزر گئیں۔ مضامین لکھتا ضرور تھا لیکن اقبالؔ پر کبھی نہیں لکھا۔ احباب نے پوچھا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں ابھی خود کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ اقبالؔ پر لکھوں۔ وہ سمجھے میں انہیں ٹال رہا ہوں اس لئے وہ خاموش رہ گئے۔ لیکن میں تب بھی سچ ہی کہہ رہا تھا۔

ایک روز میں نے خواب میں اقبالؔ کو دیکھا۔ پتہ نہیں پس منظر کیا تھا لیکن اقبالؔ اور میں، ہم دونوں اکیلے ہی دکھائی دیے۔ اقبالؔ نے میری طرف دیکھا۔ غور سے دیکھا۔ اور مسکرایا۔ اس کے لبوں پر جو تبسم تھا، اف، اگر مونا لیزا میرے سامنے ہوتی اور وہ یوں مسکراتی تو شائد میں اقبال کے اس تبسم کے آگے اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا۔ اس کے چہرے پر میرے تئیں وہ تغافل نہیں تھا جو

کسی شاعرکوشکوہ سنج بنادیتا ہے۔یعنی بقول شاعر ؎

تغافل عاشق بے تاب رابے تاب ترسازد

بہ فریاد آورد خاموشئ یوسفؑ، زلیخا را

بلکہ اس کا مجھے دیکھ کر یوں مسکرانا، کچھ دیر تک مجھے مسکراتے ہوئے دیکھتے رہنا،ایک عجیب کیف آور نظارہ تھا۔اس مسکراہٹ میں نہ جانے کیا اشارہ مضمر تھا؟لیکن میں سمجھ گیا کہ اقبالؔ میری طرزِ فکراور میرے طرزِ عمل سے مطمئن ہے۔

اب مجھے فکر ہونی شروع ہوگئی کہ شائد وقت آگیا ہے کہ میں اقبال پر کچھ لکھوں۔اس کا،اس کے عشق کااور اپنے اسلاف کی وراثت کا کچھ تو حق ادا کروں۔اس کا وہ عشق جس کے ڈانڈے سیدھے عشقِ محمدؐ سے جا ملتے ہیں۔جب سے میں نے یہ سوچنا شروع کیا،اس کی وہ مونالیزا والی مسکراہٹ آنکھوں کے سامنے رہنے لگی۔یوں لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ بیٹا! تینوں قلم وچ کِتنا دم ہے،تسی اب دکھاؤ۔(اقبال پنجابی بھی بولتے تھے)۔اب میں نے دونوں ہاتھوں سے لکھنا شروع کیا۔واقعتاً نہیں،معنوی طور پر۔یعنی ایک طرف تو ایک نظم لکھی اور دوسری طرف ایک مضمون بعنوان اقبالؔ بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔۔پھر خیال آیا کہ موزوں تو یہی رہے گا کہ یا تو اقبال کے یومِ ولادت پر یا اس کی برسی پر اسے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اس سے متعلق کوئی نئی تحریر عاشقانِ اقبال کو سونپی جائے۔یوں بھی نئی نسل اقبالؔ اور اس کی فکر سے دور ہوتی جارہی ہے کیوں کہ وہ اردو سے دور ہوتی جارہی ہے۔اسی لئے میری اس کاوش کی اہمیت ذرا بڑھ جاتی ہے۔چونکہ اقبالؔ کی شخصیت کثیر الابعاد تھی اس لئے میں نے اس کتاب یعنی 'اقبالؔ بہ چشمِ دل' میں ایسے اکابرین کی آراء جمع کی ہیں جو مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھتے تھے۔یعنی کچھ اکابرین میدانِ سیاست سے منتخب کئے تو کچھ اکابرین ایسے تھے جو اقبالؔ کے ساتھ روز اُٹھنے بیٹھنے والے تھے،ان کے احباب میں شامل تھے جن میں خصوصی طور پر سید وحید الدین فقیرؔ،مولانا غلام رسول مہرؔ،سید نذیر نیازی،عبدالمجید سالکؔ اور سر شیخ عبدالقادر کا ذکر اہم ہے۔شعبۂ مذہب سے کچھ اکابرین کے تاثرات حاصل کئے اور کچھ اکابرین

ایسے ہیں جو اقبالؔ کے ہم عصر بھی تھے اور ان کے متاخرین بھی یعنی وہ اقبالؔ کے آخری وقت کے گواہ بھی رہے اور اقبالؔ کے بعد بھی کافی عرصہ دنیا میں اپنے حصے کی زندگی بسر کرتے رہے مثلاً فیضؔ، عرفان صدیقی، شورش کاشمیری وغیرہ۔

یہ کتاب اقبال کی شخصیت پر مشاہیر اہلِ ادب کے منظوم تاثرات اور بین الاقوامی سیاسی رہ نماؤں کی قابل قدر آراء پر مشتمل ہے۔ یہ منظوم ومنثور تاثرات اقبالؔ شناسی اور اقبال فہمی کے خواہشمندوں کے لئے یقیناً ایک نئی راہ کی کُشادکا سبب بنیں گے۔ خصوصی طور پر اس صورت میں اقبالؔ کی فکر اور اس کی شاعری کی مختلف جہتوں کی تفہیم کی سخت ضرورت ہے جب کہ مشاعروں کی نوٹنکیوں نے شاعری کو محض ایک سیاسی پلیٹ فارم اور ذہنی عیش کوشی، صاحبانِ اقتدار سے شکوہ وفریاد اور حالات سے راہِ فرار اختیار کرنے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ لہٰذا ایک کوششِ مسلسل اس حالت میں ہوتی رہنی چاہیے کہ اقبالؔ کو نئی نسل کے زیرِ تعلیم اور تعلیم یافتگان کے سامنے نہ صرف متعارف کروایا جائے بلکہ اس نسل کے ذہن و دل تک اس کی فکر کی ترسیل کو آسان بنا کر پیش کیا جائے۔ یہ کتاب دنیا بھر کے اہلِ سیاست، صاحبانِ علم وادب اور علمائے دین کی نظر میں اقبالؔ کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔

ادارہ ادبِ اسلامی ہند، مہاراشٹر کی سپاس گزاری مجھ پر لازم ہے کہ ادارہ کے ذمہ داروں نے نوجوان نسل میں فکرِ اقبال کے ابلاغ اور اس کی ترسیل کے صلاح مقصد کے پیشِ نظر اس کتاب کو یومِ اقبال کی مناسبت سے اشاعت کے لئے منتخب کیا۔ امید ہے یہ کاوش پسند کی جائے گی۔

اقبالؒ بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔

خان حسنین عاقبؔ

کیا اقبال ایک شاعر تھا؟

اگر وہ شاعر تھا تو وہ ایک عام شاعر تھا یا عظیم شاعر تھا؟

یا پھر وہ ایک مفکر تھا؟

یا پھر۔۔۔۔؟

سوچتے رہیے، سینکڑوں جوابات آئیں گے، مثبت بھی اور منفی بھی۔

لیکن خود اقبال اپنے بارے میں ہر قسم کے اثبات و نفی سے بے نیاز تھا اسی لیے اس نے یہ کہہ کر دامن چھڑا لیا کہ ؂

اقبالؒ بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

اقبالؒ اپنی اُس فکر و نظر کا مبلغ اور داعی تھا جو اسے مومنانہ بصیرت اور فراست نے ودیعت کی تھی۔ اقبالؒ سے قبل اسلام ایک ایسے مذہب کی شکل اختیار کر چکا تھا جسے بنیادی ارکان کی فرضیت کی تکمیل تک محدود کر دیا گیا تھا۔ اقبالؒ اسلام کے اس روپ کا مجدّد تھا جسے اس دین کے لانے والے پیمبر ﷺ نے عربوں میں متعارف کروایا تھا اور جو فوراً اپنی حقّانیت کی بنیاد پر عرب سے نکل کر سارے عالم کو مسخّر کر چکا تھا۔ لیکن امتدادِ زمانہ نے اس روپ کو گہنا دیا تھا۔

کیا اقبال فلسفی تھا؟

شائد نہیں۔ کیونکہ فلسفے کے متعلق اس کا ایقان تھا کہ ؂

فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی۔

مگر اقبالؔ کو محض فکر و فلسفہ کا شاعر کہا گیا اور تسلیم کیا گیا۔ اقبالؔ صاحبِ نظر، صاحب بصیرت، صاحب شعور، صاحبِ ادراک، صاحبِ آ گہی تھا۔ اس کی نظر افلاک کے اس پار تک جاتی تھی۔ مثل مشہور ہے۔

جو نہ دیکھے روی
وہ دیکھے کوی

یعنی جہاں تک روی (سورج) کی روشنی نہیں پہنچ سکتی اس سے آگے تک شاعر کا تخیل پہنچ جاتا ہے۔
اور اقبالؔ تو اس سے بھی آگے کی چیز تھی۔
اس کی شاعری آوازِ جرس تھی جو پکارتی تھی کہ ؂

معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

اس کا آہنگ آفاقی تھا جب وہ کہتا تھا کہ

نغمہ ہندی ہے تو کیا، لَے تو حجازی ہے مری

اس نے اپنی بصیرت کو اپنے مرشد مولانا جلال الدین رومیؔ کی فکری نہج پر مرتکز کر رکھا تھا۔ یعنی بقولِ سعدی شیرازی ؂

اے تماشہ گاہِ عالم، روئے تو
تو کجا بہرِ تماشہ می روی؟

اسی بصیرت نے اقبال کو قلندرانہ مقام عطا کیا۔ اور اس امر کا اعتراف اس نے یہ کہہ کر کیا کہ۔

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے؟ شاعری کیا ہے؟

یہ اس کی بے نیازی تھی خود کے تئیں اور اس بے نیازی پر وہ حیراں ہو کر خود سے استفسار کرتا ہے کہ ؂

کہاں سے تو نے اے اقبال! سیکھی ہے یہ درویشی؟
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

اس کی یہی بے نیازی اسے مسلسل محوِ جستجو رکھتی تھی کہ وہ اپنی ہستی، اپنے وجود کی تہہ تک پہنچ سکے، یعنی ؎

اسی اقبالؒ کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا

لیکن یہ وہ مقام تھا جہاں آ کر اسے کچھ کچھ احساس اپنے وجود کا ہونے لگا تھا۔ اگرچہ یہ احساس بہ نظرِ غائر، ایک شاعرانہ تعلّی سے زیادہ نہیں لگتا۔ لیکن اس کے اس احساس میں تشکیک اور شبہ تھا۔

رازِ حرم سے شائد، اقبالؒ باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

یہاں 'شائد' نے اسے یقین کی منزل سے دور رکھا اور پھر اقبال دہرانے لگا کہ ؎

اقبالؒ بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

پھر اس کا تذبذب اسے ایک نئے موڑ پر لے آیا جس کا اظہار اس نے یوں کیا ؎

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبالؒ
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

یہیں تک آ کر، ذرا ٹھہر کر، اس نے طنزیہ مطالبہ کیا کہ ؎

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گری ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

لیکن اس کا یہ طنزیہ مطالبہ سنجیدگی سے لیا گیا اور اس کے شوق کو رومیؒ کی سالاری میں دے دیا گیا۔ یہاں اس نے خود کو مخاطب کر کے احساس دلایا ؎

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبالؒ
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومیؒ

حالانکہ کچھ دیر پہلے تک اقبالؔ متذبذب تھا کہ قافلۂ حیات تو ایک عجیب معرکۂ گنجلک اور مجموعۂ اسرار ہے۔جب وہ بولا کہ ؎

ڈرتا ہوں دیکھ دیکھ کے اِس دشت و در کو میں
لاؤں کہاں سے بندۂ صاحب نظر کو میں؟
حیراں ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں
رومیؔ یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں؟

لیکن اس کا جذبۂ شوق رومیؔ کی سالاری کو تسلیم کر بیٹھا اور اس نے رومیؔ کو اپنا مرشد قرار دے کر کہا ؎

اے امامِ عاشقانِ دردمند
یاد ہے مجھ کو ترا حرفِ بلند

یہاں اس نے حرفِ بلند کو درسِ بلند کے معنی میں لیا ہے اور رومیؔ کو اپنا مرشد تسلیم کرتے ہوئے اپنی فکر کے سوتوں کو رومیؔ کی اس آبجو سے جا ملایا جو کہہ رہی تھی کہ ؎

جہد کن در بے خودی، خود را بیاب
زود تر واللہ اعلم با الصواب

حالانکہ اس کے سامنے متاعِ گفتار کے حامی کثیر تعداد میں موجود تھے۔

نایاب نہیں متاعِ گفتار
صد انوریؔ و ہزار جامیؔ

پتہ نہیں کیوں اس کی نظرِ انتخاب رومیؔ پر جا ٹھہری۔لیکن اپنی فکر کی سالاری کے لئے رومیؔ کے انتخاب نے اس کے ذوق اور شوق کو تشنہ کام نہیں رہنے دیا۔اس نے رومیؔ سے اکتسابِ علمِ روحانی کیا۔وہیں اس نے خدا کو سمجھا، خود کو جانا، خدائی کو پہچانا اور خودی سے متعارف ہوا۔خودی سے اس کے تعارف نے اس میں اس قدر اعتماد پیدا کر دیا کہ اس نے ایک تصوراتی لیکن قریب القیاس واقعہ کے ذریعہ اپنی خود اعتمادی کا اظہار کر دیا ؎

فردوس میں رومیؔ سے یہ کہتا تھا سنائیؔ
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ، وہی آش
حلاجؔ کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

یہیں سے وہ لا شعوری طور پر خود آگاہی کی طرف ملتفت ہوتا رہا۔لیکن اس کی یہ خود آگاہی جنوں کا لبادہ اوڑھے رہی ۔وہ خود اپنی اس خود آگاہی کو جنوں سے تعبیر کرتا رہا ۔

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

وہ ہمیشہ اپنے جنوں کو عقل کی غلامی میں دینے سے بچتا رہا اور دوسروں کو بھی تلقین کرتا رہا کہ ۔

بہتر ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اس کی خودی کو کبھی بھی پاسبانئ عقل کا احتیاج نہیں رہا۔اس کی نَوا سنجی سے لالے کی آگ تیز ہو جایا کرتی تھی ۔اقبالؔ کے دم سے جو ہماہَمی بنی ہوئی تھی اس کے لئے اسے موردِ الزام ٹھہرایا گیا اور فیصلہ کر دیا گیا کہ ۔

اقبالؔ کے نَفَس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

لیکن اقبالؔ جیسا قلندر ایسے کسی فیصلے کو خاطر میں لانے والا کب تھا؟اس کا جنوں تو ہنگامہ خیز تھا جس پر اسے ناز بھی تھا اور فخر بھی ۔اسی جنوں نے اس کی زباں سے دعوی کروایا کہ ۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جُنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

پھر وہ اپنا رخ مندرجہ بالا فیصلے کی طرف موڑتے ہوئے فیصلہ کنندگان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا
نسیمِ صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

مرشدِ رومیؔ نے اقبالؔ کے اندر جو علمِ کیمیا بھر دیا تھا اس نے اقبالؔ کے عجز و انکسار کو شعور و اعتبار میں تبدیل کر دیا۔ یہاں سے اس کا لہجہ بدلنے لگا۔ اب اس کی تشکیک نے اعتماد کی چادر اوڑھ لی تھی۔ اس نے اعتراف کیا۔

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبالؔ اگرچہ بے ہنر ہے
اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

لیکن اس جگہ وہ چوک گیا۔
وہ بھول گیا کہ فلسفے کے متعلق اس نے تو کہا تھا کہ ؂

فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی۔

پھر وہ سنبھل گیا کہ اس کی مراد موجودہ فلسفہ در معنیٔ رائج العام نہیں تھا۔ یہ کوئی ہیگل، برگساں، نطشے، گوئٹے یا مارکس کا فلسفہ نہیں تھا جس کی وہ بات کر رہا تھا۔ یہ تو اس کا اپنا، اس کے محبوب موضوعِ خودی کا فلسفہ تھا جس کا درس اس نے اپنے مرشدِ رومیؔ سے لیا تھا جس کے بارے میں اس نے ایک دفعہ کہا تھا ؂

گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک
کہ تو ہے نغمۂ رومیؔ سے بے نیاز اب تک

اپنی خودی کے اس فلسفے کو وہ عام لوگوں کی نظروں سے بچانے کی حتی الامکان کوشش کرتا رہا۔

اسے اندیشہ تھا کہ اس کے فلسفۂ خودی میں پوشیدہ پیام کو سطحی نظروں سے دیکھنے والے شائد سمجھ نہ پائیں۔خود اس نے بھی دانستہ اس فلسفہ کی توسیع میں کچھ ابہام رکھ چھوڑے ہیں کہ آج تک اس کے فلسفۂ خودی کے شارحین نئے نئے پہلوؤں سے اس کی تشریح کرتے رہے ہیں جبکہ وہ خودکلامی کرتا ہے ۔

اقبالؔ! یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے مولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

اس کا یہ سفر، خودفراموشی سے خودآگاہی کا سفر، اسے اپنے ساتھ نہ جانے کتنی درس گاہوں، خانقاہوں، مدرسوں، فلسفہ گاہوں، علم خانوں کی سیر کرواتا رہا لیکن وہ ان سب کا شاکی رہا۔اس نے بے باکی سے کہا ۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی، نہ معرفت، نہ نگاہ

وہ مزید بولا ۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا، لا الہ الااللہ

یہ اس کی کوفت تھی جو اس کے تجربات و مشاہدات کو شعور و ادراک کے روزن میں داخل کر کے شعر بن کر جھانک رہی تھی۔ مگر وہ خود کو اسرارِ شعر کا محرم بتانے سے گریز کرتا رہا۔اس نے کہا ۔

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے، تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریلؑ ہے یا بانگِ سرافیلؑ

یہ سب اس کے شعور کی کارستانیاں تھیں جس نے اسے خود آگاہی سے آگے نکل کر خدا آگاہی تک پہنچنے کا حکم دے رکھا تھا۔ وہ خود کتنا عجیب تھا کہ جب جرمنی میں تھا تو پڑھائی تو فلسفہ کی کرتا تھا لیکن خلوتوں میں بھی اور جلوتوں میں بھی خودی کے جلووں میں گم ہو جاتا تھا۔ اس کی ساتھی عطیہ فیضی اسے جھنجوڑتی کہ اقبالؔ! اٹھو، یہ یوروپ ہے۔ مادّیت کے اس کارخانے میں تمہاری اس کیفیت کو یہاں کوئی نہیں سمجھے گا۔ وہ شانے جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوتا اور گنگنانے لگتا ؎

صد کتاب وصد ورق در نار کُن
سینہ را از عشقِ او گلزار کُن

پھر آسماں کی طرف دیکھ کر کہتا ؎

کہہ جاتا ہوں میں زورِ جنوں میں ترے اسرار
مجھ کو بھی صلہ دے میری آشفتہ سری کا

بات پھر آجاتی ہے اس کے احساسِ آگاہی پر۔ وہ خدامست و خود آگاہ تھا تو اس بات کا اقرار کیوں نہیں کرتا تھا اور ؎

اقبالؔ بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔

کی رٹ کیوں لگائے ہوئے تھا؟ شواہد، اس کی شاعری، اس کی خودی، سب مل کر اس کے احساسِ آگاہی کی غمازی کرتے تھے۔ مگر وہ خود اس قدر عجز سے کام کیوں لیتا تھا؟

شائد یہ اس کا اضطراب تھا۔ وہ مزید علم، مزید آگاہی کا طلب گار تھا اور ربِ زدنی علماً کا وظیفہ پڑھتا رہتا تھا۔ اور 'مالا تعلم' کا ورد کرتا رہتا تھا۔ کبھی وہ مظاہرِ فطرت سے ہم کلام ہو کر کہتا کہ ؎

اے بادِ بیابانی ! مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی

ہاں، وہ یہی چاہتا تھا کہ اس کی آگاہی کا احساس اس کے دَروں ہی میں پوشیدہ رہے اور وہ اپنی اس آگاہی کو خاموشی، دل سوزی، سرمستی اور رعنائی کے نقاب میں چھپا لیتا۔ اس لیے کہ اس کا ایقان

صائبؔ کے اس تصور پر بھی تھا کہ ؎

ہماں بہتر کہ لیلی در بیاباں جلوہ گر باشد

ندارد تنگنائے شہر تابِ حسنِ صحرائی

یعنی وہ خود اپنے الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ ؎

میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

مگر اس کی قلندری، اس کی بے نیازی اور اس کے عجز سے زیادہ عرصہ تک تال میل نہیں بنا سکی اور پھر وہ قلندری ہی کیا جو فقر کی آغوش میں نہ پلی ہو؟ اور وہ فقر، کون سا فقر تھا؟ کیا وہ فقر کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیے گلی گلی گھومنے والا اور نانِ جویں کا سوال کرنے والا فقر تھا؟ نہیں۔ خود اس نے کہا کہ میرا فقر، فقرِ گدایانہ نہیں ہے بلکہ فقرِ مومن ہے اور جب اس سے استفسار کیا گیا کہ فقرِ مومن کیا ہے، اس کا مفہوم واضح کرو، تو اس نے جواب دیا ؎

فقرِ مومن چیست ؟ تسخیرِ جہات

بندہ از تاثیرِ او، مولا صفات

اس کا یہی وہ فقر تھا جس نے اس کی قلندری کی پرورش کی۔ اس کی یہ قلندری اسی کے بقول ؎

قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

اسے اپنی اس قلندری کا اس درجہ احساس تھا کہ اس نے اپنی آگاہی کے بہت سے شعبوں کو اسی سے معنون کیا اور کہا کہ ؎

اگر جہاں میں میرا جوہر آشکار ہوا

قلندری سے ہُوا ہے، تَونگری سے نہیں

اس کی اس قلندری نے اسے تونگری سے دور دور ہی رکھا۔ یہاں تک کہ جب اس نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا تو صرف اتنا ہی کماتا جتنا اس کی اور اہلِ خانہ کی ضروریات کے لیے کافی ہوتا۔ جب لوگ از راہِ عقیدت اپنے مقدمات اس کے پاس لاتے کہ آپ ہمارا مقدمہ چاہے جیتیں یا ہاریں،

ہمیں کوئی غرض نہیں، بس آپ ہمارا مقدمہ لیں۔ تو وہ صاف انکار کر دیتا کہ میری ضروریات توفی الوقت اسی سے پوری ہو جاتی ہیں۔ میں مزید مقدمات لے کر الجھن میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اور پھر وہ اپنا بقیہ وقت نہاں خانہ لاہوت کی عقدہ کشائیوں کی نذر کر دیتا۔ اس منزل پر پہنچ کر احتیاط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتا کہ ؎

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

وہ بھول جاتا کہ وہ تو ہمیشہ یہ کہتا رہا ہے کہ ؎

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

پھر وہ اپنی آ گہی کو علی الاعلان موضوعِ سخن کیوں بنا رہا ہے؟ لیکن اس کی یہ آ گہی مومنانہ آ گہی تھی جس کا کبھی کبھی اعلان بالجہر بھی مستحسن و مفید مانا جاتا ہے۔ اس کے لیے مومن پر اس شرط کی تکمیل لازمی تھی کہ ؎

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

عمر میں اس سے اٹھارہ سال بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے جب پوچھا کہ اقبال! تو جو مومن، مومن کہتا رہتا ہے، مجھے بتا کہ مومن کی پہچان اور شناخت کیا ہے؟ تو وہ مسکرا کر بولا ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید، تبسم برلبِ اوست

اس کا مردِ مومن تب تک اس کی نظر میں مومن نہیں تھا جب تک وہ ایمان کے تین اجزاء یعنی قرآن، عشقِ محمد اور شریعت سے مکمل طور سے رجوع نہ ہو جائے۔ اس نے قرآنِ حکیم کو فکر و تدبر کا

ماخذ مانا اور کہا ؎

آں کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم
حکمتِ او ، لا یزال است و قدیم

اور اس نے قرآنِ حکیم کی صرف اتنی تعریف پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دو قدم آگے بڑھ کر جہدِ حیات میں ایک مومن کے لیے اس کے لزوم کو یہ کہہ کر قطعیت دی کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

اب اس نے قرآن کے بعد اس شئے کو لازمی قرار دیا جس کا اقرار خود اللہ نے کیا یعنی حُبِّ مصطفی ﷺ۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ حُبِّ مصطفی ﷺ سے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ قدرے بے نیاز ہوتا جا رہا ہے۔ یعنی ؎

عصرِ ما، ما را، زِ ما ، بیگانہ کرد
از جمالِ مصطفی ﷺ بیگانہ کرد

اس لیے اس نے اسلاف کی رَوِشِ مومنانہ کی بازیافتگی پر زور دیتے ہوئے کہا ؎

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفی ﷺ، عقل تمام بو لہب

اور اپنے اندر اس عشق کی شعلگی کا احساس اس کو یوں تھا کہ ؎

عشق در من ، آتشے افروخت است
فرصتش بادا کہ جانم سوخت است

اس کو محمدِ عربی ﷺ سے اس درجہ عشق تھا کہ اس دنیا میں تو وہ جب جب ذکرِ احمد ﷺ سنتا، اس کی آنکھوں سے اشکِ عقیدت رواں ہو جاتے۔ لیکن اس عشق کو اس کا تصور آخرت میں بھی ملحوظ رکھتا تھا۔ اس نے ایک دفعہ اللہ سے کہا ؎

تو غنی از ہر دو عالم، من فقیر
روزِ محشر، عذر ہائے من پذیر
تو اگر بینی حسابم نا گزیر
از نگاہِ مصطفی ﷺ پنہاں بگیر

اسے اتنا تو علم تھا کہ عشقِ محمد ﷺ کے بغیر نہ زندگی میں کوئی لطف ہے نہ آخرت کا کوئی مزہ۔اور عشقِ محمد ﷺ کا حصول راہِ محمد ﷺ یعنی شریعت پر چلے بغیر ممکن نہیں۔اس لیے اس نے اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی کہ اس کے شعروں اور اس کی شاعری کے توسط سے مسلمان شریعتِ محمدی ﷺ کی اہمیت سمجھ لیں۔اس نے بڑی متانت اور اخلاص کے ساتھ یعنی پورے شرحِ صدر کے ساتھ کہا ۔

با تو گویم سرِ اسلام است شرع
شرع آغاز است و انجام است شرع

اس نے مسلمان کے قلبِ صمیم پر گویا ایک سرِ نہاں کو منکشف کر دیا ہے۔اس نے شریعت کے اتباع کو اسلام کا آغاز اور شریعت کے اتباع پر ہی ایک مومن کے لیے اسلام کا اختتام قرار دیا ہے۔یہ اس کی آگہی نہیں تھی تو پھر کون سا امر تھا؟اس نے مزید آگے بڑھ کر شریعت کے اتباع کی راہ پر چلنے کا طریقہ بھی بیان کر دیا جب اس نے کہا کہ ۔

چوں اسیرِ حلقۂ آئیں شود
آہوئے رم، خوئے او مشکیں شود
در شریعت، معنئ دیگر مجو
غیر ضو ،در باطن ِگوہر مجو

اس نے اہلِ ایمان عوام الناس کو اس رمز سے بھی آگاہ کر دیا کہ شریعت کا اتباع کرتے وقت جس امر اور جس بات کا جو مفہوم نکلتا ہے اس سے وہی مراد لیا جائے۔اور شریعت میں غیر مطلوب قیل

وقال سے مکمل پرہیز و اجتناب برتا جائے۔ جیسے کسی موتی کے باطن میں ہیرے کی روشنی ڈھونڈنا خلافِ عقل ہے اسی طرح شریعت میں کسی ایک مخصوص امر کے معنی وہی لئے جائیں جو اس شریعت کے وضع کنندہ کی منشاء کے مطابق ہوں۔ اس کی نظر میں شریعت کا یہی مفہوم و مطلب تھا۔

یہاں سے اس کی آگہی کا سفر ایک ایسے مقام کی طرف رجوع ہوتا ہے جو باطنی شفافیت اور قلبی تطہیر سے آمیز ہوتا ہوا خواہشاتِ نفسانی کو زیر کرتا ہے اور ہوسِ انسانی کو اخلاص اور پاکیزگی کی چاشنی میں ڈبو کر اسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر کے صرف خالق حقیقی سے لو لگانے کی تحریک دیتا ہے۔ یعنی منزلِ آخرت!!!

یہاں بھی اس نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی اور خواہش ظاہر کی کہ ؎

ہست شانِ رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

اپنے خالق سے دعا کرتے ہوئے وہ پہلے اسے اس کی رحمت کا حوالہ دے رہا ہے کہ اے میرے اللہ! تیری رحمت تو سارے جہاں، سارے عالم کو نوازنے والی ہے۔ اور میں بس اتنی آرزو رکھتا ہوں کہ اگر مجھے موت آئے تو سرزمین حجاز پر آئے۔ جہاں تیرا گھر ہے اور جہاں تیرا رسول ﷺ محوِ آرام ہے۔ تو میری اتنی آرزو پوری کر دے۔ وہ مزید کہتا ہے ؎

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش
تا بیاساید دلِ بے تابِ من
بستگی پیدا کند سیمابِ من

سرزمین حجاز پر موت آنے کی اس کی خواہش تو پوری نہ ہوئی لیکن اس کے خالق نے اس کے عوض اسے ایسی جگہ، ایسا مقام اس دنیا میں عطا کر دیا کہ اردو اور فارسی بولنے اور سمجھنے والے دنیا کے تمام ممالک میں تقریباً ہر مسجد کے منبر سے بلاتفریق مسلک و جماعت اس کے کلام، اس کی شاعری

اوراس کے نظریات کو بطور تفسیر و تشریح پیش کیا جاتا ہے۔کیا یہ کم بڑی بات ہے؟ پھر یہ احساسِ آگہی کی کون سی منزل تھی جہاں ایک خود آگاہ اور خدا آگاہ شاعر کہہ رہا ہے کہ ؎

اقبالؔ بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

دراصل اس نے اپنی آگہی اور احساسِ آگہی کو اپنے اکتساب کردہ طرزِ حیات کے ماتحت کر دیا تھا۔اس کا ایقان بھی یہی تھا کہ کبریائی، علمِ جبروت اور ان سب کے دعوے، یہ سب خالق کو زیبا ہیں مخلوق کو نہیں۔اس لیے وہ اپنے احساسِ آگہی سے نکلنے والی صدائے 'می دانم' کو 'نمی دانم' میں بدل دیتا تھا جس کے بعد وہ پھر آواز لگاتا تھا کہ ؎

اقبالؔ بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

ورنہ بچپن میں ایک مرتبہ جب وہ مدرسہ دیر سے پہنچا اور استاد نے اس سے اس تاخیر پر استفسار کیا تو وہ یہ کیسے کہہ پاتا کہ اقبال ہمیشہ دیر ہی سے آتا ہے۔اگر وہ آگہی کی برداشت و تحمل کا مادہ نہ رکھتا تو ایک عظیم انسان اور ایک منفرد شاعر کیسے بنتا؟ اس کی آگہی اور اس آگہی کا ادراک و شعور، جیسا میں نے قبلاً عرض کیا ہے، قرآن، عشقِ نبی ﷺ اور شریعت کی تفسیر تھا۔اسی لیے وہ زندگی کی حقیقت کو سمجھ پایا اور اہلِ ایمان کو اسی زندگی کے رموز سے واقف کروا سکا کہ ؎

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

اسی خیال کو اس نے اردو سے فارسی میں منتقل کر کے کہا ؎

زندگی جز لذتِ پرواز نیست
آشیاں با فطرتِ او ساز نیست

یعنی زندگی حرکت و حرارت سے عبارت ہے، قیام سے نہیں۔زندگی کی لذت پروازِ مسلسل میں ہے نہ کہ قیامِ آشیاں میں۔اس سے قبل بھی وہ کہہ چکا تھا کہ ؎

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

اور اس نے زندگی کو سرِ نہاں مان کر اس پر یوں حجت تمام کی ؎

زندگی جز قوتِ اعجاز نیست
ہر کسے دانندۂ ایں راز نیست

اس کا احساسِ آگہی اسے 'خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری' کی تلقین کرتا رہتا تھا۔ اس لیے وہ عوام الناس کی بہ نسبت بہت کچھ جانتے ہوئے بھی اعادہ کرتا رہتا تھا کہ ؎

اقبالؔ بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

میں نے اس کے احساسِ آگہی اور پھر اس کے اعلانِ عدم آگہی کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے کلام کو ملحوظ رکھا ہے۔ ورنہ اگر میں صرف اردو کا کلام پیش کرتا تو شائد یہ جائزہ اتنا سیر حاصل اور اطمینان بخش نہ ہو پاتا جتنا اس کا تقاضہ ہے۔ میں اس جائزہ کو اقبال ہی کے اعترافِ گناہ پر ختم کرتا ہوں۔

ترا گناہ ہے اقبالؔ مجلس آرائی
اگرچہ تو ہے مثالِ زمانہ کم پیوند

اقبالؒ کے دو قومی نظرئے کی حقیقت

خان حسنین عاقبؔ

میں اپنے اس مقالہ کی ابتداء ہندوستان کے ایک مایہ ناز سپوت کے ایک خط کے ان الفاظ سے کرتا ہوں۔

''ڈاکٹر اقبالؒ مرحوم کے بارے میں مَیں کیا لکھوں؟ لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم ُسارے جہاں سے اچھا) ہندوستاں ہمارا' پڑھی تو میرا دِل بھر آیا۔اور یاروده (یروڈہ، پونے) جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔''

یہ سپوت تھا بابائے قوم مہاتما گاندھی جنہوں نے اقبالؒ کے انتقال کے بعد مورخہ ۹ جون ۱۹۳۸ کو سیوا گرام، وردھا سے لکھے اپنے ایک خط میں اقبالؒ سے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا۔ یہ خط گاندھی جی نے اردو رسم الخط میں ہی لکھا ہے اور یہ اقبالؒ کی ہندوستانیت کو بھر پور خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ بقول اقبالؒ ؎

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

آج کے میرے اس مقالہ کا عنوان دراصل اِدھر کچھ دنوں سے پھر سے اقبالؒ کو دو قومی نظریہ کا بانی اور قیامِ پاکستان کا ذمہ دار قرار دینے کی تحریک کے پس منظر میں کشید کیا گیا ہے۔ کچھ رسائل اور کچھ اخبارات میں پھر یہ بحث چھڑی ہے اور اس کے منطقی اور تاریخی ردِ عمل کے طور پر میں اپنا یہ مقالہ رقم کر رہا ہوں۔ ہمارے بزرگ اور انصاف پسند عاشق اردو، قلمکار جناب رام پرکاش کپور

صاحب کا ایک مضمون ''اقبال اور پاکستان'' ماہنامہ 'ایوانِ اردو' کے فروری ۲۰۱۴ کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ موصوف نے بڑا دیانتدارانہ جائزہ لیا ہے اس موضوع کا۔ انہوں نے مسلم لیگ کے ۱۹۳۰ میں الٰہ آباد میں ہوئے آل انڈیا سیشن میں اقبال کے صدارتی خطبے سے یہ اقتباس نقل کیا ہے۔

''اس لئے مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے، بالکل حق بجانب ہے۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ 'ہندوستان کے جسدِ سیاسی کے اندر رہتے ہوئے' اگر مسلمانوں کو پورا موقع دیا گیا تو شمالی ہندوستان کے مسلمان بیرونی حملوں کے خلاف، خواہ وہ سنگینوں سے کئے جائیں یا افکار سے، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔''

بس، اقبالؒ کا یہی خیال دراصل ان تمام غلط فہمیوں کی جڑ ہے جسے دانستہ طور پر پیدا کیا گیا اور ان کی خوب اشاعت کی گئی۔ اور خصوصی طور پر اقبال کے انتقال کے بعد تو ان عناصر کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا کہ اس کے فوراً بعد یا اسی دوران دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی اور پھر ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی گہما گہمی میں ان غلط فہمیوں نے اپنا کردار خوب خوب نبھایا۔ ہم اگر اقبالؒ کے اسی خطبے کی بات کریں تو آئیے، اس کے مختلف اجزاء پر غور کرتے ہیں۔ پہلے اس جملے کو لیتے ہیں کہ 'ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے'۔ ایک موٹی عقل والا شخص بھی سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان کے 'اندر' سے مراد ہندوستان کے ٹکڑے کرکے یا اسے تقسیم کرکے نہیں ہوتا بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ 'ہندوستان کی جغرافیائی، سیاسی اور معاشرتی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے (نہ کہ ایک ملک کو دو ممالک میں تقسیم کرتے ہوئے) اسی ایک ملک میں مسلمانوں کے لئے ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے۔ یہاں کوئی صاحب پھر اعتراض کر سکتے ہیں کہ اس سے اقبالؒ کا مقصد ہندوستان کو مسلمان ہندوستان بنانا تھا یا اقبالؒ ہندوستان کو مسلمان ہندوستان بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے تو میں یہ واضح کر دینا عین فرض سمجھتا ہوں کہ اس سے مراد یہ ہرگز نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے 'اندر' کے معنی یہی لئے جاسکتے ہیں کہ ہندوستان کی سالمیت کے ساتھ مشروط، اس کے ایک اٹوٹ حصے

کے طور پر، نہ کہ ہندوستان سے ٹوٹ کر۔ چلئے، ہم فرض کر لیتے ہیں کہ بہت سے سر پھروں کی خواہش کے عین مطابق اگر آج ہندوستان، پاکستان پر حملہ کرکے اسے ہندوستان میں دوبارہ ۱۴اگست ۱۹۴۷ کی حالت یعنی غیر منقسم ہندوستان کے طور پر ضم کر لیتا ہے، تو پھر یہ پاکستان کیا ہندوستان کی ایک مسلم اکثریتی ریاست ہوگی یا نہیں؟ بالکل یہی صورتِ حال ہوگی اور یہی صورتِ حال اگر اقبالؒ آزادی سے قبل آزاد ہندوستان کی چاہتے تھے تو اس میں کیا غلط تھا؟ اور اقبال کوئی سیاسی آدمی تو تھے نہیں۔

یہاں ہم مولانا مودودیؒ کی یہ رائے بڑے احترام کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ ان کی اصابتِ رائے پر تو کسی غیر کو بھی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ مولانا، اقبالؒ کے انتقال کے بعد اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں۔

''سیاسیات میں ان کا نصب العین محض کامل آزادی ہی نہ تھا، بلکہ وہ آزاد 'ہندوستان میں' دارالاسلام کو اپنا مقصودِ حقیقی بنائے ہوئے تھے۔''

یعنی اقبالؒ کا تصور یہ تھا کہ متحدہ اور آزاد ہندوستان میں ہی ایک الگ ریاست قائم ہو جس کی حیثیت وفاقِ ہند کے زیرِ انتظام کام کرنے والے صوبے کی ہو۔ مولانا مودودیؒ مزید لکھتے ہیں۔

''اس لئے (اقبالؒ) ایسی کسی تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھے جو ایک دارالفکر کو دوسرے دارالفکر میں تبدیل کرنے والی ہو۔ صرف یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عملی سیاسیات میں ان لوگوں کے ساتھ مجبورانہ تعاون کیا جو برٹش گورنمنٹ کے زیرِ سایہ ہندوراج کے قیام کی مخالفت کر رہے تھے۔ گو مقاصد کے اعتبار سے ان میں اور اس طبقہ میں کوئی ربط نہ تھا۔ مگر صرف اس مصلحت نے ان کو اس طبقے (مسلم لیگ) کے ساتھ جوڑ رکھا تھا۔ جب تک مسلمان نوجوانوں میں 'دارالسلام' کا نصب العین ایک آتش فروزاں کی طرح بھڑک نہ اُٹھے اور وہ اس کے لئے سرفروشانہ جدوجہد (تحریکِ آزادیٔ ہند) کے لئے آمادہ نہ ہوں، اس وقت تک انقلاب (جدوجہدِ آزادیٔ ہند) کے رخ کو بالکل دوسری جانب (برٹش حکومت کے کسی سازشی جال میں پھنسنے سے) پلٹ جانے سے روکے رکھا جائے۔''

یہ ہے وہ حقیقت جس کا اقرار کرنے کی جرأت کم ہی لوگ کرتے ہیں۔اگر اقبالؒ پاکستان کے حامی ہوتے تو آزاد ہندوستان کے پہلے صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد اقبالؒ کے بارے میں یہ نہ کہتے کہ :

''ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ نے اپنے اشعار سے ہندوستان (پاکستان نہیں) میں نئی روح پھونک دی اور ان کے کچھ شعرا تنے ہر دل عزیز ہو گئے ہیں کہ ہندوستان کے سبھی حصوں میں گائے اور پڑھے جاتے ہیں۔جو بیداری انہوں نے اپنی شاعری سے پیدا کی ہے اس میں کسی کو کسی طرح کا عذر نہیں ہو سکتا۔جب آج کی بہت پریشان کُن مشکلات طے ہو جائیں گی اور آج کی بہت سی باتیں لوگ بھول جائیں گے،اس وقت سر محمد اقبالؒ کے اشعار ہندوستان کو (پاکستان کو نہیں) جگاتے رہیں گے۔''

(ڈاکٹر راجندر پرساد۔محررہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء۔جوہرِ اقبالؒ۔مرتبہ۔سید حسنین)

یاد کیجئے کہ ڈاکٹر راجندر پرساد اقبالؒ کی وفات کے بعد آزاد ہندوستان میں ان کے مقام و کردار کا تعین اور پیش بینی کر رہے ہیں کہ آزاد ہندوستان میں اقبالؒ کے اشعار ہندوستان کو جگاتے رہیں گے۔الفاظ دیکھئے،'جب آج کی بہت پریشان کُن مشکلات طے ہو جائیں گی اور آج کی بہت سی باتیں لوگ بھول جائیں گے،اس وقت سر محمد اقبالؒ کے اشعار ہندوستان کو (پاکستان کو نہیں) جگاتے رہیں گے'۔یعنی راجندر پرساد کے دِل میں ذرا سا بھی خیال نہیں تھا کہ اقبالؒ کو کبھی تنگ نظر لوگ پاکستان کا بانی بھی قرار دیں گے۔اسی لئے وہ ''پریشان کُن مشکلات'' کے طے ہو جانے کے بعد،جب کہ آج (یعنی تحریکِ آزادی کی) بہت سی باتوں کو لوگ بھول جائیں گے،اس وقت بھی اقبالؒ کے اشعار ہندوستان کو جگاتے رہیں گے۔راجندر پرساد جی نے یہ نہیں کہا کہ اس وقت اقبالؒ کے اشعار'پاکستان کو'یا دارالاسلام کو یا مسلمانوں کو جگاتے رہیں گے بلکہ یہ کہا کہ ''ہندوستان'' کو جگاتے رہیں گے۔

اگر اقبال عاشقِ ہند نہ ہوتے تو گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور،یوں نہ کہتے کہ:

''ڈاکٹر اقبالؒ اپنی وفات سے ہمارے ادب میں ایسی جگہ خالی کر گئے ہیں جس کا گھاؤ مدتِ مدید میں بھی مندمل نہیں ہو سکتا۔ہندوستان (پاکستان نہیں) کا رتبہ آج

دنیا کی نگاہ میں اتنا کم ہے کہ ہم کسی حالت میں ایسے شاعر کی کمی برداشت نہیں کر سکتے
جن کے کلام نے عالم گیر مقبولیت حاصل کر لی تھی۔''

اب بتائیے، کیا ڈاکٹر سر رابندر ناتھ ٹیگور کسی بانیٔ پاکستان کے وفات پر ان جذبات کا اظہار کر سکتے تھے؟ اس صورت میں جب کہ اقبالؔ تو اس دنیا سے چلے گئے تھے اور ان کے افکار پر گفتگو کے بعد خود اقبالؔ کی جانب سے ہر قسم کے اعتراض کی مدافعت کا امکان ختم ہو چکا تھا۔

پھر کچھ لوگ دانستہ اقبالؔ کی کردارکشی دو وجوہات سے کرتے ہیں۔ اول تو لاعلمی اور دوم تعصب۔ لاعلمی کی مثال ''جوہرِ اقبالؔ نامی کتاب کے مرتب عاشق اقبال مرحوم سید حسنین صاحب کا یہ جملہ جو اسی کتاب میں صفحہ ۶۹ پر درج ہے کہ'' (آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں) انہوں نے ہندوستانیوں کے آپس کے مناقشات کو دور کرنے کے لئے پاکستان کی معرکتہ الآراء تجویز پیش کی''۔ جب کہ اس اجلاس میں اقبال نے لفظ 'پاکستان' کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ صرف مسلمانوں کے لئے ایک الگ ریاست کی بات کی تھی۔ ایک دوسری مثال جنتا پارٹی حکومت کے دوران وزیرِ اعظم مرار جی دیسائی نے اردو گھر میں منعقد ایک تقریب کے موقع پر اقبالؔ کا قومی ترانہ 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' سننے کے بعد فرمایا تھا ''معلوم نہیں علامہ اقبالؔ آزادی کے بعد پاکستان کیوں چلے گئے؟'' (بحوالہ رام پرکاش کپور) بتائیے کہ ہندوستان جیسے عظیم ملک کے وزیرِ اعظم کی اپنے ملک کی جدوجہد آزادی کی تاریخ سے اتنی لاعلمی نے ہم جیسے ہندوستانیوں کو کس درجہ کوفت میں مبتلا کر دیا ہوگا؟ جب کہ اقبالؔ کا انتقال آزادی سے نو برس پہلے ہو چکا تھا اور وہ کہیں گئے نہیں تھے بلکہ وہ متحدہ ہندوستان کے جس شہر میں رہتے تھے وہ آزادی کے بعد تقسیم ہو کر پاکستان بن چکا تھا۔

اب میں دوبارہ اقبالؔ کے اسی اجلاس میں پیش کئے گئے صدارتی خطبے کا اقتباس پیش کرتا ہوں ''اس لئے مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے، بالکل حق بجانب ہے۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ ہندوستان کے جسدِ سیاسی کے اندر رہتے ہوئے اگر مسلمانوں کو پورا موقع دیا گیا تو شمالی

ہندوستان کے مسلمان بیرونی حملوں کے خلاف، خواہ وہ سنگینوں سے کئیے جائیں یا افکار سے، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔' سید حسنین صاحب بھی اس بات کو نہ سمجھ سکے کہ اقبال 'ہندوستان کے جسدِ سیاسی' کے اندر رہتے ہوئے' کہہ رہے ہیں۔ کیا آج پاکستان ہندوستان کے 'جسدِ سیاسی' میں قائم ہے؟ کیا یہ پاکستان وہ ہے جس کا خواب اقبالؔ نے دیکھا تھا؟ دونوں سوالات کے جوابات نفی میں آئیں گے۔ اب آئیے، دوسری وجہ یعنی تعصب کی طرف۔ اقبال کے اس اقتباس کے اس آخری حصے کی طرف نہ اُس وقت توجہ دی گئی اور نہ اب کسی نے توجہ دی ہے۔ یہی جملے تو تقریباً پون صدی سے چلی آرہی اقبالؔ مخالف مہم کی اصلیت کو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اقبالؔ کا نظریہ دوقومی نہیں تھا لیکن اس بے چارے کو 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' لکھنے کے باوجود اولین 'بانیانِ پاکستان' میں شمار کیا گیا۔ اور یہ الزام آج تک اس پر لگا ہوا ہے۔ اقبال کے سر دوقومی نظریے کا ٹھیکرا پھوڑنے والوں نے یہ حقیقت کیوں فراموش کر دی کہ اقبال سے بہت پہلے یعنی ۱۹۲۴ کے انگریزی اخبار ٹریبیون میں لالہ لاجپت رائے نے لکھا تھا، 'پنجاب کو دو صوبوں یعنی مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب میں تقسیم کر دیا جائے۔ مغربی پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت ہو اور مشرقی پنجاب میں ہندوؤں کی'۔ اگر ان دونوں محولہ بالا بیانات کا دیانتدارانہ مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ لالہ لاجپت رائے کے یہاں دوقومی نظریہ تو ۱۹۲۴ ہی میں جڑ پکڑ چکا تھا جس کا سب سے اہم خالق ہندو مہاسبھا کا مینوفیسٹو تھا۔ اگر لالہ جی کے اس دوقومی نظریے کا اقبالؔ کے بیان سے موازنہ کیا جائے تو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ اقبالؔ تو ہندوستان کے اندر ہی ایک مسلم ریاست کی بات کر رہے تھے اور وہ بھی مسلم لیگ کے صدارتی پوڈیم سے، اسی مسلم لیگ کے پوڈیم سے جس کے گلے میں دوقومی نظریے کی تخلیق کا طوق باندھا جاتا ہے۔ دراصل دوقومی نظریے اور ملک کی تقسیم کا منصوبہ تو بہت پہلے ہی مہاسبھا تیار کر چکی تھی۔ مسلم لیگ نے تو بعد کے دور میں اسے گلے لگایا جب مسلمانوں کے خلاف فسادات اور غارت گری کا ماحول تیار کیا گیا تا کہ مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا جا سکے کہ وہ آزاد ہندوستان میں محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ اس سازش کو مسلم لیگ کی

قیادت سمجھ نہیں پائی اور اس نے وہ دوقومی نظریہ جس کی خالق مہاسبھا تھی، اس نظریہ کی وکالت شروع کردی۔ یعنی تقسیم کی سازش تیار تو کہیں اور ہوئی، بندوق کسی اور کی تھی اور اسے کندھے میسر آئے مسلم لیگ کے۔ ان سطور میں پیش کئے گئے خیالات کو مسلم لیگ کی حمایت پر محمول نہ کیا جائے بلکہ حقیقت کو سامنے لانے کی ایک کوشش کے طور پر دیکھا جائے۔ اگر اسلام کے نکتۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو اسلام اگر دوقومی نظریے کی حمایت کرتا تو پھر اقبالؒ، طارق بن زیاد کی زبان سے ان خیالات کا اظہار کیوں کرتے کہ ؎

ہر ملک، ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

یہاں تو صاف صاف دوقومی نظریے کو سرے سا خارج کر دیا گیا ہے۔ پھر اقبالؒ کے سر اس جرم نا کردہ کا ٹھیکرا کیوں پھوڑا جا رہا ہے؟ اقبالؒ تو ہندوستان ہی میں ایک مسلم ریاست کے قیام کی بات کر رہا تھا اور اسی متحدہ ہندوستان کی حفاظت کا ذمہ اس مسلم ریاست کے کندھوں پر رکھنا چاہ رہا تھا جس کی تقسیم کا طوق اس کے سر باندھا گیا۔ اقبالؒ ملک کی جغرافیائی تقسیم کے قائل تو کبھی نہیں تھے۔ نہ ان کے ذاتی خیالات سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور نہ ہی اقبالؒ کے کلام میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان کا سارا کلام تو ہر قسم کے اتحاد پر دلیل ہے۔ کیا یہ شعر اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

کیا اس شعر میں اس کے مخاطب مسلمان ہیں؟ نہیں! اس کے مخاطب بلالحاظِ مذہب وملت، تمام ہندوستانی ہیں۔ چاہے وہ مسلم ہوں یا ہندو، سکھ ہوں یا کسی اور مذہب کے پیروکار۔ اقبالؒ سے متعلق یہ ساری غلط فہمیاں پھیلی نہیں، پھیلائی گئی ہیں۔ آخر صلیب کے لئے کوئی عیسیٰؑ بھی تو چاہئے نا! تو چلئے، صلیب تو بنالی گئی تھی، اب تلاشِ عیسیٰ تھی تو اس کے لئے اقبالؒ میسر آ گئے۔ دسمبر ۲۰۱۳ کے ایوانِ اردو میں بھی رام داس نادار صاحب کا مضمون رام پرکاش کپور صاحب کی طرح میں نے بھی پڑھا تھا لیکن میں نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی۔ کپور صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس نازک

موضوع کو چھیڑا ہے۔ نادار صاحب نے مسلم لیگ کے کل ہند اجلاس میں اقبالؒ کے صدارتی خطبے کا سنہ ۱۹۰۶ دیا ہے۔ اس برس تو اقبالؒ خود تیس برس سے کم عمر کے شاعر تھے اور یہ دور اقبالؒ کی ملی شاعری کا دور تھا بھی نہیں۔ یعنی اس برس تک تو یہ اقبالؒ وہ اقبالؒ نہیں تھا جو بعد کو بنا۔ اور کیا مسلم لیگ کے پاس سینئر سیاسی رہنماؤں کی کمی تھی جو وہ ایک نوجوان شاعر کو اس کا صدر بنا دیتے؟ اس برس تک تو نہ ہندوستان کی مکمل آزادی کی بات چھڑی تھی اور نہ ہی جنگِ عظیم اول کا آغاز ہوا تھا جس نے ہندوستان کے سیاسی حالات کے بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اور رہی بات ۱۹۳۰ میں اقبال کے دو قومی نظریے کے پیش کش کی تو جیسا میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ اس سے چھ برس پہلے ہی لالہ لاجپت رائے ٹریبیون میں اس دو قومی نظریے کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کر چکے تھے۔ اور ۱۹۳۰ میں بھی اقبال نے دو قومی نظریہ نہیں پیش کیا تھا بلکہ ایک ہی ملک ہندوستان کی داخلی جغرافیائی حدود کے اندر ہی اندر ایک مسلم ریاست کے قیام کی بات کی تھی نہ کہ ایک الگ پاکستان کے قیام کی۔ یہ بات تو آج ایک معمولی فراست کا حامل شخص بھی سمجھ سکتا ہے کہ تقسیمِ ہند سے کس کو فائدہ پہنچا ہے؟ مسلمانوں کو اس سے کیا مِلا؟ تقسیمِ ہند کے بعد سے ہی نہ پاکستان کے مسلمان چین سے ہیں اور نہ ہی ہندوستان کے مسلمان اندرونی ریشہ دوانیوں سے اپنا پیچھا چھڑا پائے ہیں۔ جب ایک اوسط ذہن کا شخص یہ بات سمجھ سکتا ہے تو کیا اقبالؒ جیسا دوراندیش مفکر اور دانشور اتنی بات نہیں سمجھ سکتا تھا کہ تقسیمِ مِلک مسلمانوں کے حق میں نہیں ہے؟ یقیناً اقبالؒ کو اس کا احساس تھا اسی لئے جب ایڈورڈ تھامس نے اقبالؒ کی زندگی ہی میں ان کے نظریے سے متعلق اپنے مضامین میں غلط فہمیاں پھیلانی شروع کر دیں تو اقبال نے مارچ ۱۹۳۴ میں اپنے ایک خط میں اس مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے کلکتہ کے راغب احسن کو لکھا کہ 'براہِ کرم دھیان دیجئے کہ میری اسکیم کو نظریہ پاکستان سے (ایڈورڈ تھامس) مخلوط کر رہا ہے۔ میں تو انڈین فیڈریشن میں ہی ایک مسلم صوبہ کی تشکیل کا حامی ہوں۔ جب کہ نظریہ پاکستان میں شمال مغربی ہند کے صوبوں کی ایک الگ فیڈریشن کی بات کہی گئی ہے جو براہِ راست انگلستان سے مربوط ہوگا۔' اس خط کا ذکر بھی کپور صاحب کے مذکورہ مضمون میں موجود ہے۔ اب ستم

ظریفی دیکھئے کہ اقبال کو اندیشہ یہ تھا کہ اگر پاکستان بن جاتا ہے تو وہ براہِ راست انگلستان سے مربوط ہوگا لیکن انہیں کیا پتا تھا کہ ہوا تو ایسا ہی لیکن انگلستان کی جگہ اب امریکہ نے لے لی ہے۔اور آج کا پاکستان امریکہ سے جس طرح مربوط ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔اسی لئے اقبال نے پاکستان کی حمایت تو دور کی بات ہے بلکہ اس کے قیام کی مخالفت ہی کی ہے۔اور ان کے پیشِ نظر جو اندیشے تھے وہ درست بھی ثابت ہوئے ہیں۔اقبالؔ نے جب مسلمانوں کے لئے ایک الگ صوبے کی بات کی تو اس وقت تک یہ بات بھی واضح نہیں تھی کہ آیا برطانیہ ہندوستان کو آزاد بھی کرسکتا ہے۔اسی لئے اقبالؔ نے مندرجہ بالا خط میں یہ بات کہنی بھی ضروری سمجھی کہ:

'میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان سے الگ پاکستان نہ ہندوؤں، نہ مسلمانوں اور نہ برطانوی سامراج کے لئے مفید ہوگا۔'

اقبالؔ کے اس عقیدہ کے لئے اس وقت کے عالمی سیاسی ماحول کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ اس وقت تک برطانیہ جنگِ عظیم اول کے نقصانات جھیل چکا تھا اور مجلسِ اقوام کی ناکامی نے اس کے وجود کی بساط لپیٹ کر رکھ دی تھی۔دنیا ایک مرتبہ پھر عالمی جنگ کے دہانے پر کھڑی ہوئی تھی۔بہر حال، اقبال اور پاکستان کے موضوع پر غلط فہمیوں کا یہ Pandora's box دانستہ طور پر اور نادانستہ طور پر، بہ ہر دو لحاظ، ایک سازش کی تکمیل کا حصہ ہے۔مجھے ونڈسر، کینیڈا میں مقیم پروفیسر سید عاصم علی صاحب کے ایک مضمون ''دو قومی نظریے کا اصل موجد'' کے مطالعے کا بھی موقع ملا جو ہفت روزہ 'گواہ' حیدرآباد میں شائع ہوا تھا۔موصوف دو قومی نظریے کے ضمن میں اقبالؔ کے کردار پر نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔'بعض لوگ اس نظریے کا سُراغ علامہ اقبالؔ کے بعض بیانات سے بھی لگاتے ہیں۔یہ صحیح ہے کہ اقبالؔ کے پیشِ نظر ایک ایسی خود مختار سیاسی اکائی کا خیال ضرور تھا جہاں اسلام کے آفاقی اصولِ حکمرانی کا تجربہ کیا جاسکے مگر وہ یہ سیاسی تجربہ ہندوستانی وفاق کے اندر رہتے ہوئے کرنا چاہتے تھے اور وہ بھی اسلام کے نظامِ عدل کو بروئے کار لانے کی غرض سے۔اس کے لئے کوئی ایسا کلیہ ان کی عظیم آفاقی اسلامی فکر سے برآمد نہیں ہوتا جس میں ملک کی جغرافیائی تقسیم تو ہو مگر اسلام کے آفاقی اصولِ

عدل وانصاف کی عملی تعبیر سے خالی۔'(اور اقبالؒ کے تصور کے عین برعکس آج کا پاکستان جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان سے الگ بھی ہے اور اسلام کے اصولِ حکمرانی واصولِ عدل وانصاف سے خالی بھی۔یعنی یہ اقبالؒ کا خواب تھا ہی نہیں جس کی تعبیر کو اقبالؒ سے منسوب کیا جارہا ہے۔حسنین عاقبؔ) پروفیسر عاصم علی مزید لکھتے ہیں:'اور ایسی تقسیم جو صرف مراعات یافتہ افراد کے مفادات کی حفاظت کے خیال سے عمل میں لائی جائے،ان کے(اقبالؒ کے) حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی۔اگر تقسیمِ وطن کا ایسا کوئی منصوبہ ان کے سامنے لایا جاتا تو اس کی تائید تو درکنار،شائد وہ اس کے شدید ترین مخالفین میں ہوتے۔اقبالؒ کے پیشِ نظر تو برطانیہ کا اخلاقی اور روحانی انحطاط تھا جس کے بارے میں انہوں نے لندن کی کیمبرج یونیورسٹی میں ۱۹۳۱ میں جب وہ دوسری گول میز کانفرنس کے لئے وہاں گئے تھے، کیمبرج کے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

The biggest blunder made by Europe was the separation of Church and State. This deprived their culture of moral soul and diverted it to the atheistic materialism.The European war of 1914 was an outcome of the aforesaid mistakes made by the European nations in the separation of theChurch and the State.

اور اسی کو اقبال نے اپنے اس شعر میں بیان بھی کیا ہے کہ ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبالؒ ہندوستان کو بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں کو بالخصوص دین اور سیاست کی اس علیحدگی سے بچانا چاہتے تھے نہ کہ وہ ایک ملک کو دو ملکوں میں تقسیم کرنا چاہتے تھے۔۲۱ جون ۱۹۳۷ کو،یعنی اپنے انتقال سے چند ماہ قبل اقبالؒ نے محمد علی جناح کو لکھا۔

A separate federation of Muslim Provinces, reformed on the lines I have suggested above, is the only course by which we can secure a peaceful India.

یعنی اقبال کو اپنے آخری وقت میں تک یہ خیال نہیں تھا کہ ہندوستان سے الگ کوئی علیحدہ ملک مسلمانوں کے مسئلے کا حل ہوسکتا ہے۔ جناح کو بھی انہوں نے لکھا کہ 'مسلم علاقوں پر مبنی ایک علیحدہ وفاق کی تشکیل ہی کے ذریعے ہم ایک ''پرامن ہندوستان'' (پھر غور کریں کہ پرامن پاکستان نہیں) حاصل کرسکتے ہیں۔' اور اقبالؒ اس علیحدہ مسلم وفاق کی ضرورت کیوں محسوس کررہے تھے، اس کا سبب آگے چل کر انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو لکھے ایک خط میں نہرو ہی سے بیان کیا۔ یہ اقبالؒ کے خدشات تھے جو اپنی جگہ ایک تلخ حقیقت کا درجہ رکھتے تھے۔ اقبالؒ نے نہرو کو لکھا۔

In conclusion I must put a straight question to Pundit Jawhar Lal, how is India's problem to be solved if the majority community will neither concede the minimum safeguards necessary for the protection of a minority of 80 million people, nor accept the award of a third party; but continue to talk of a kind of nationalism which works out only to its own benefit?"

(آخر میں، میں پنڈت جواہر لال نہرو کے سامنے ایک سوال رکھتا ہوں۔ اگر (ہندو) اکثریت نہ ہی (اس ملک کی) آٹھ کروڑ اقلیتی نفوس کی سلامتی اور حفاظت کے لئے لازمی اقل ترین اقدامات کا اہتمام کرے اور نہ ہی کسی کی ثالثی قبول کرے، بلکہ محض اپنی مطلب براری اور اپنے مفادات کے لئے ایک خاص قسم کی 'قومیت' کی باتیں کرتی رہے، تو پھر 'ہندوستان' کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟) دراصل یہی وہ خدشات تھے جو آزادی کے حصول سے قبل اقبالؒ کے ذہن میں تھے اور جو آج سو فی صد سے

بھی زیادہ درست ثابت ہو رہے ہیں۔سوچئے کہ اس صورت میں بھی اقبال علیحدہ ملک کی نہیں بلکہ اسی ملک کے اندر ایک ریاست کی بات کر رہے تھے۔مسلم اکثریتی ریاستوں میں اسلام کے اصولِ عدل و انصاف کا تجربہ انکے پیشِ نظر ضرور تھا اور شدت سے تھا مگر ہندوستان کو ایسے سیاسی ٹکڑوں میں بانٹ دینا جو ہمیشہ باہم متحارب و متصادم رہیں (جب کہ یہ دونوں ٹکڑے آج ہندوستان اور پاکستان کے نام سے باہم شدید متحارب اور متصادم ہیں)،ان کے سامنے نہیں تھا۔یہ تو انیس سو بیس اور انیس سو تیس، ان دو دہائیوں کے دوران ہندوستان میں مسلم مخالف فسادات اور ان فسادات کو ہوا دینے میں ہندو انتہا پسندوں کے ساتھ ساتھ کانگریس کے مشتبہ کردار کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم پذیر طلبا کی ایک تنظیم نے ایک پمفلٹ ۱۹۳۳ میں جاری کیا جس کا عنوان تھا۔NOW OR NEVER اس تنظیم نے مسلم لیگ کے لاہور اجلاس میں اقبالؔ کے پیش کردہ وفاق سے یکسر اختلاف کیا اور چودھری رحمت علی نے لفظ پاکستان وضع کیا۔یعنی اقبالؔ جس وفاق کی بات کر رہے تھے، پاکستان کے حامی اس معاملے میں اقبالؔ کی تجویز کی مخالفت کر رہے تھے۔لیکن چونکہ یہ نسبتاً غیر معروف طلبا کا گروہ تھا اس لئے کسی نے ان کو اس بات کا کریڈٹ نہیں دیا اور اقبالؔ کو اس بات کا کریڈٹ دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جو ان کے ذہن میں نہیں تھی۔چنانچہ عظیم ہندوستانی مفکر،شاعر اور فلسفی اقبالؔ کو دو قومی نظریے کا موجد قرار دینا ممکن نہیں۔اس گفتگو کی رو سے اقبالؔ کا نظریہ دو منقسم قوموں کا نہیں،بلکہ ایک ہی متحدہ ملک میں دو خود مختار ریاستوں کی تشکیل کا تھا اور اسی نظریے کے تحت آج ہندوستانی وفاق میں تقریباً ۳۵ خود مختار ریاستیں قائم ہیں۔وہیں ایک علیٰحدہ مسلم ریاست بھی ہوتی۔لیکن یہ شائد چند شدت پسندوں کو منظور نہیں تھا۔اس لئے ایک ہی ملک کے مسلم اکثریتی حصے کو ناسور کی طرح کاٹ کر پھینک دیا گیا اور اس کا الزام بھی اسی ملت،اسی قوم پر لگا یا گیا جو اس تقسیم سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والی تھی۔ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ہر قولِ اکبر و اصغر پر آنکھ بند کر کے یقین نہ کرتے ہوئے اپنی بصارت کے ساتھ ساتھ اپنی بصیرت سے بھی کام لیا جائے اور جستجو کی جائے کہ سچ کیا ہے اور پروپیگنڈا کیا ہوتا ہے۔اقبال کے سر

سے اس بوجھ کو ہٹایا جائے جس میں اس کا اپنا کچھ نہیں تھا۔ اقبالؔ تو خود اپنے آپ کو ہندوستان کا ایسا مایہ ناز سپوت مانتے تھے جو خود کو ہندوستان سے الگ محسوس ہی نہیں کرتے تھے اور اپنے برہمن زادہ ہونے پر شرمندہ بھی نہیں تھے۔ بقول اقبالؔ ؎

مرا بینی کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادہ و رمز آشنائے روم و تبریز است۔

ماخذات ومنابع :

1 کلیاتِ اقبالؔ

2 دوقومی نظریہ کا موجد کون؟ از پرفیسر سید عاصم علی، کینیڈا۔ ہفت روزہ گواہ۔ حیدرآباد)

3 اقبال اور پاکستان۔ رام پرکاش کپور۔ (ماہنامہ ایوانِ اردو، جنوری ۲۰۱۴)

4 The Reconstruction of Religious Thought in Islam. Dr. Mohammad Iqbal. Lahore. 1930

5 Iqbal and two nation Theory. widipedia.

6 www.allamaiqbal.com/webcont/16/Two nation Theory.htm

7 Pakistan Affiars. Online

8 زندہ رود۔ از جسٹس جاوید اقبال۔ سنگِ میل پبلی کیشن۔ لاہور۔

9 India wins Freedom. by Maulana Abul Kalam Azad .Orient Longman. India.

10 Ten Years To Freedom.Kanji Dwarka Das. Times Publications. 1958

11 جوہرِ اقبال۔ محمد حسنین سید۔ ملی پبلی کیشنس۔ نئی دہلی۔

منظومات

سیمابؔ اکبرآبادی

اقبالؔ! اے خودی کے پیامی، خدا شناس
حق کے نواشناس ہیں تیرے نواشناس
اے فلسفیٔ مشرقِ ہستی، حکیمِ ہند
اے رازدارِ سرِ حقیقت، کلیمِ ہند

اے آبروئے ملتِ اسلام، جانِ قوم
قائم وطن میں تیری بدولت ہے شانِ قوم
انسانیت کو تونے دیا سرِ آگہی
تاریکیوں میں روح کی پھیلائی روشنی
تیری نظر سے تیز ہوئی نبضِ مضمحل
بخشا ہے تونے قوم کو اک سوزِ مستقل
اک ضربِ لا سے توڑ دیے بتکدے تمام
انفاسِ آتشیں سے لیا بجلیوں کا کام

ملت کو استوار کیا دل کی آگ سے
بخشی حیات ضربِ کلیمی کی لاگ سے
میخانۂ الست سے لے کر مئے خودی
فکر و نظر سے شعر کے سانچے میں ڈھال دی

پھر ناخنِ خرد کو کیا تو نے بخیہ گر
سیتی رہی جراحتِ دل کو تری نظر
عرفانِ خود شناسئ انساں ترا پیام
دکھتے ہوئے دلوں کو سہارا ترا کلام

پرواز تیری فکر کی تھی اس قدر بلند
پہنچے جہاں پہ شہپرِ جبریل کو گزند
تیرے سخن کا رنگ ہی پیغمبرانہ تھا
ہندی تھی جس کی لے، یہ حجازی ترانہ تھا
جب قوم کے عروج کا افسانہ ہوگا عام
لکھا ہوا بخطِ جلی ہوگا تیرا نام
جب قوم کے عروج کا پھر دور آئے گا
کوشش میں تیرا نام بہر طور آئے گا۔

مولانا ظفر علی خان

گھر گھر تھا یہی چرچا کہ اقبال کا مرنا
اسلام کے سر پر ہے قیامت کا گزرنا

تھا اس کے تخیل کا فسوں جس نے سکھایا
سو سال کے سوئے ہوئے جذبوں کو ابھرنا

ہر روز دیا اس نے مسلماں کو یہی درس
ہرگز نہ کسی سے بجز اللہ کے ڈرنا

ملت کو نئی زندگی اقبال نے دی ہے
ممکن نہیں اس بات کا اقرار نہ کرنا

مولانا ماہر القادری

کارواں خواب میں تھا بانگِ درا سے پہلے
ساز میں سوز نہ تھا تیری نوا سے پہلے
اللہ اللہ ترا قافلۂ نطق و کلام
بالِ جبریل کے سائے میں ہوا گرمِ خرام

تو کبھی شعلۂ رقصاں کبھی رفتارِ نسیم
موجِ کوثر ترے اشعار، کہیں ضربِ کلیم
اک نئی طرز، نئے باب کا آغاز کیا
شکوہ اللہ سے پھر تونے بصد ناز کیا
حسن والفت کے فسانوں میں ہوس شامل تھی
تونے تقدیس عطا کی اسے، عصمت بخشی
چہرۂ فکر و معانی کو نکھارا تونے
زلفِ دوشیزۂ اردو کو سنوارا تونے
تونے ہر گام پہ کچھ نقشِ وفا چھوڑے ہیں
تونے تہذیبِ فرنگی کے صنم توڑے ہیں
تیرے شعروں میں کہیں معرکۂ بدروحنین
کہیں ایمانِ براہیمؑ، کہیں عزمِ حسینؓ
علم وحکمت کے مسائل کو دیا شعر کا رنگ
کس نزاکت سے ہم آغوش کئے شیشہ وسنگ

اس لئے ہے تری اک ایک مجھے بات قبول
تیرا سرمایۂ دانش تھا فقط عشقِ رسول
فکرِ افسردہ کو پرواز عطا کی تونے
لبِ خاموش کو آواز عطا کی تونے

ابوالاثر حفیظ جالندھری

غم حوصلہ مند ہو گیا ہے
دل صبر پسند ہو گیا ہے
دریا دریا تھے مرے آنسو
وہ چشمہ ہی بند ہو گیا ہے
غم کھانے کی ہو گئی ہے عادت
یہ زہر بھی قند ہو گیا ہے
کچھ لطف نہیں ہے زندگی کا
ہر سانس گزند ہو گیا ہے
ہاتھوں سے خوشی کا بہر بہانہ
پرواز پرند ہو گیا ہے
اندازِ حیات و مرگِ اقبال
میرے لئے بند ہو گیا ہے
دنیا میں بڑا تھا اس کا رتبہ
عقبیٰ میں دو چند ہو گیا ہے

اقبالؔ بلند تھا ہمارا
اب اور بلند ہو گیا ہے

اقبالؒ کے مزار پر

ابوالاثر حفیظؔ جالندھری

لحد میں سو رہی ہے آج بے شک مُشتِ خاک اُس کی
مگر گرمِ عمل ہے، جاگتی ہے جانِ پاک اُس کی
وہ اک فانی بشر تھا، میں یہ باور کر نہیں سکتا
بشر اقبالؒ ہو جائے تو ہرگز مر نہیں سکتا
بہ زیرِ سایۂ دیوارِ مسجد ہے جو آسودہ
یہ خاکی جسم ہے ستّر برس کا راہ پیمودہ
یہ خاکی جسم بھی اس کا بہت ہی بیش قیمت تھا
جسے ہم جلوہ سمجھے تھے، وہ پردہ بھی غنیمت تھا
اسے ہم ناپتے تھے لے کے آنکھوں ہی کا پیمانہ
غزل خواں اس کو جانا ہم نے، شاعر اس کو گردانا
فقط صورت ہی دیکھی، اس کے معنی ہم نہیں سمجھے
نہ دیکھا رنگِ تصویر، آئنے کو دل نشیں سمجھے
ہمیں ضعفِ بصارت سے کہاں تھی تابِ نظّارہ
سکھائے اس کے پردے نے ہمیں آدابِ نظّارہ
یہ نغمہ کیا ہے زیرِ پردہ ہائے ساز کم سمجھے
رہے سب گوش بر آواز، لیکن راز کم سمجھے

شکستِ پیکرِ محسوس نے توڑا حجاب آخر
طلوعِ صبحِ محشر بن کے چمکا آفتاب آخر
مقیّد اب نہیں اقبالؔ اپنے جسمِ فانی میں
نہیں وہ بند حائل آج دریا کی روانی میں
وجودِ مرگ کی قائل نہیں تھی زندگی اس کی
تعالی اللہ، اب دیکھے کوئی پائندگی اس کی
جسے ہم مردہ سمجھے، زندہ تر، پائندہ تر نکلا
مہ وخورشید سے ذرے کا دل تابندہ تر نکلا
ابھی اندازہ ہوسکتا نہیں اس کی بلندی کا
ابھی دنیا کی آنکھوں پر ہے پردہ فرقہ بندی کا
مگر میری نگاہوں میں ہیں چہرے ان جوانوں کے
جنہیں اقبالؔ نے بخشے ہیں بازو قہرمانوں کے

خوش نَوا فقیر

فیض احمد فیضؔ

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دُھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں
اس گیت کے تمام محاسن ہیں لا زوال
اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثل شعلۂ جوالہ تند و تیز
اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ وحشتِ صرصر سے بے خبر
یہ شمع بزمِ صبح کی آمد سے بے خبر

شکیلؔ بدایونی

ملکِ سخن کا تاجورِ حال اٹھ گیا
دنیا سے اہلِ علم کا اقبال اٹھ گیا
مہرِ علومِ مغربِ اقصیٰ ہوا غروب
مشرق کا چاند نیرِ اقبال اٹھ گیا
اب ہائے ترجمانِ حقیقت کہیں کسے؟
حق آشنا بزرگِ کہن سال اٹھ گیا
نالاں ہے دورِ ماضی و مستقبلِ حیات
مسند نشینِ انجمنِ حال اٹھ گیا
اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا کہہ کے روئیے
دنیا سے اعتبارِ مہ و سال اٹھ گیا
تھا اس کی مثل کوئی نہ ہوگا اب اس کی مثل
وہ بے مثال، حیف! کہ امسال اٹھ گیا
شاعر، ادیب، فلسفی، عارف، خداشناس
مجموعۂ کمال تھا، اقبالؔ اٹھ گیا
تھی اس کی شاعری حدِ تخئیل سے بلند
کر کے زمینِ شعر کو پامال اٹھ گیا
اس کی خوشی کا راز تھا بیداریٔ حیات
خوش طبع، خوش مزاج، خوش اعمال اٹھ گیا

تاریخِ انتقال رقم کیجئے شکیل
بدرِ کمال وعزت و اقبال اٹھ گیا

کھل جائیں شکیلؔ اس پر اسرارِ خداوندی
اقبال کے شعروں کو انسان اگر سمجھے

ڈاکٹر سید عابد حسین

لطفِ مجلس کیا رہا، جب میرِ مجلس اٹھ گیا
وائے ناکامی کہ بزمِ اہلِ دل برہم ہے آج
تھا جہاں کل نغمۂ مستانہ کو جوش و خروش
ہے وہاں آہِ مسلسل ، نالۂ پیہم ہے آج
سینۂ مسلم کہ تھا گنجینۂ شوق و امید
ہے وفورِ یاس اس میں، اور ہجومِ غم ہے آج
فکر کی جب سالِ رحلت کی تو دل نے دی صدا
ملتِ اسلام میں اقبالؒ کا ماتم ہے آج

لمعہ حیدرآبادی

خود داریٔ عشّاق ہے ہر بات میں تیری
گیرندۂ آفاق ہے تیری ہی فقیری
پرُ کیف دعاؤں سے تری مردِ خود آگاہ
زندہ ہے زمانے میں فقیروں کی امیری

--

تو ہے شاہِ جہانِ بے نیازی
ہے عالم گیر تیری لے نوازی
ہیں نازاں تجھ پہ عطّار و سنائی
مریدِ پیرِ رومیؔ، مردِ غازی

مردِ دانش حاضر

حامدالانصاری غازیؔ

امامِ فلسفہ و مردِ دانش حاضر
محمدِ عربی ﷺ کا غلام اور شاعر
وہ مردِ شعر وسخن ، راہِ قدس کا راہی
ملی تھی حق سے جسے نعمتِ خود آگاہی
وہ اک مردِقلندر،قلندری میں امیر
وہ جس کا فقر دلیل شکوہِ صدشاہی

--

خودی کے بھید کو دنیا پہ کھولنے والا
خدا کی راہ میں حق بات بولنے والا
مقامِ عشق کے راز و نیاز کا محرم
متاعِ حسن کو لفظوں میں تولنے والا

--

وہ مردِ فکر ونظر ، رہ نوردِ راہِ ثبات
وہ جس کی ایک صفت مایۂ ہزار صفات
وہ جس کے نطق سے ٹوٹا تھا پھر طلسمِ جمود
وہ مردِحکمت و دیں، واقفِ متاعِ حیات

--

وہ مردِ جہد و عمل جس کی ضرب تھی کاری
وہ جس کا علم، جلال و خودی و خود داری
وہ جس کے فیض سے شاداب روح کی دنیا
وہ جس کا حوصلۂ فکر، دل کی بیداری

--

وہ فلسفیٔ حق آگاہ ،وہ حکیم و جلیل
وہ جس کا فلسفہ دیتا ہے دعوتِ تکمیل
وہ جس کی بانگِ درا، روحِ کاروانِ حیات
وہ جس کے نطق کا ہر لفظ اک صدائے رحیل

--

وہ جس کا نطق ہے اعجاز دین قیم کا
وہ جس کا قلب تھا اک راز دین قیم کا
جنونِ عشق میں خود دار، قوم کا اقبالؔ
وہ سرفروشی کی تحریک، قوم کا سردار

آشنائے ہر مزاج

عبرتؔ صدیقی بریلوی

کائنات رنگ و بو ہے دامن اقبال میں
پھول کھلتے ہی رہیں گے گلشن اقبال میں
شاعرِ خوش فکر، اے فخرِ جہانِ شاعری
تیرا لوہا مانتے ہیں اہلِ بینش آج بھی
فکر سے تیری جہانِ شاعری کو ہے ثبات
ہر تخیل ہے ترا اک جرعۂ آبِ حیات
مشعل راہِ ادب ہے جذبۂ منزل رسی
زندگی گویا ہے تیری رہنمائے زندگی
حسنِ تہذیب و تمدن کو اجاگر کر دیا
دامن ہستی ادب کے موتیوں سے بھر دیا
دل ہوئے بیدار ارماں کروٹیں لینے لگے
تیرے میٹھے بول ہیں جیسے کہ جھونکے صبح کے
قوم کے غم میں ترا رونا ہے ساون کی بھرن
مسکرا اُٹھے دلوں میں حبِ قومی کے چمن
فلسفی، شاعر، مصور اور ادیبِ دیدہ ور
سو تکلم کھلتے ہیں اس کے لب خاموش پر
انتہائے یاس میں دیکھی گئی لب پر ہنسی
تیرے نوحے میں بھی ہے سازِ طرب کی نغمگی

تیری فکرِ نکتہ رس ہے آشنائے ہر مزاج
اہلِ بینش سے لیا ہے داد و تحسیں کا خراج
فرد اپنے رنگ میں ہے تیرا اندازِ بیاں
تو ہے فخرِ ہند، فخرِ ایشیا، فخرِ جہاں
نظم میں یکسر تصنع سے کیا ہے اجتناب
درحقیقت ہے ترا طرزِ نگارش لاجواب
اے مفکر ، جس قدر بھی تیری تصنیفات ہیں
فلسفہ، حکمت، تصوف، ان کے موضوعات ہیں

السّلام اے اخترِ علم وادب

ابوالخیر نشترؔ

السلام اے اخترِ علم و ادب، شعر وسخن
السلام اے جانِ محفل، رونق بزمِ چمن
تیری تخلیقات سے ہم کو ملی ہے روشنی
ہر قدم پر آگہی ہے ہر قدم پر رہبری
تیرے اندازِ تفکر نے نرالی راہ لی
منزلِ معراجِ ہستی کرلے حاصل آدمی
تیری پروازِ تخیل پر تصدق جان وتن
السلام اے اخترِ علم و ادب شعر وسخن
یوں تو میخانے میں آئے اور بھی میکش بہت
تونے حق ساقی کا لیکن بزم کیں پورا کیا
دے کے ہم کو عالم ہستی کی ساری دلکشی
جام وساغر کو مئے عرفان سے پھر بھر دیا
تونے بخشا ہے بشر کی زندگی کو بانکپن
السلام اے اخترِ علم و ادب، شعر وسخن
اس مقامِ زیست کا رہبر بنا اقبال تو
جس بلندی پر کبھی جبریل کا مسکن رہا
فرد قائم ربطِ ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
پھر پرونے کے لیے باہم یہ مصرع کہہ دیا

تیرے صدقے، تیرے قرباں، شاعرِ تشنہ کا فن
السلام اے اخترِ علم و ادب، شعر و سخن
عظمتِ ہندوستاں تھی تیرے دل میں اس طرح
جیسے چاہت کی بلندی کا ہو نقطہ آخری
کہہ دیا اہلِ جہاں سے ہند اپنا خوب ہے
تو حقائق کی نظر میں ایک تھا مردِ جری
ساتھ ہے تیرے ہمالہ، ساتھ ہے گنگ و جمن
السلام اے اخترِ علم و ادب، شعر و سخن
تو نے غافل قوم کو پیغامِ بیداری دیا
دل میں احساسِ خودی ہی زندگی کی شان ہے
یہ نہیں تو پیکرِ خاکی کی قیمت کچھ نہیں
در حقیقت آدمیت کی یہی پہچان ہے
مردِ آہن، تیری سیرت ہر جگہ جلوہ فگن
السلام اے اخترِ علم و ادب، شعر و سخن
شاعرِ مشرق! تری حشمت و شہرت دائمی
صحنِ عالم سے تری خوشبو نہ جائے گی کبھی
انقلاباتِ زمانہ کا اثر تجھ پر نہیں
تیرے گلشن میں خزاں ہرگز نہ آئے گی کبھی
حشر تک قائم رہے گی تیرے شعروں پر پھبن
السلام اے جانِ محفل، رونق بزمِ چمن
السلام اے اخترِ علم و ادب، شعر و سخن

اعجاز در گفتارِ او۔۔۔

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی

در کشورِ شعر و سخن، مبعوث شد پیغمبرے
شیریں رقم، شیریں سخن، شیریں زباں، شیریں بیاں
اخلاص در کردارِ او، اعجاز در گفتارِ او
ہر نطق گوہر بارِ او، مصحف برائے شاعراں
آں بے کساں را یاورے، آں مفلساں را دولتے
شعرش برائے منعمے، یک شعلۂ آتش فشاں
از بہر ہر افتادۂ، فکرش بہ کار آمادۂ
وز بہرِ خواجہ زادۂ، ہر مصرعش اژدر دہاں
آیاتِ قرآں جامِ او، عرفانِ مئے گلفامِ او
پیغامِ حق پیغامِ او، زندہ کن و روحِ رواں
از بہرِ قومِ خستہ پا، ہر نغمہ اش بانگِ درا
باشد زِ شورِ ایں صدا، بیدار گردد کارواں
مجنونِ لیلائے وطن، پیوستہ شیدائے وطن
در دل، تمنائے وطن چوں گنگ در ہندوستاں
از بہرِ دل، بہرِ جگر، ہر جملہ اش یک نیشتر
پوشیدہ در شعرش اثر، چوں مضمر اندر جسم جاں

تفریق نسل و رنگ را باعث بود کہ جنگ را
شستہ زِ دل ایں رنگ را باقی نماند از وے نشاں
در عالماں محمود او، در شاعراں محسود او
دانائے مشرق بود او، نازک خیال و نکتہ داں
از قلب برخاست ایں صدا، وا حسرتا! وا حسرتا!
آں بلبلِ رنگیں نوا، اقبالؔ شد خلد آشیاں

چراغِ جادۂ احساس

سیدہ شانِ معراج

چراغِ جادۂ احساس ہے درسِ خودی تیرا
حقیقت ہی حقیقت ہے پیامِ شاعری تیرا
کمالِ فن ترے قدموں پہ اپنا سر جھکاتا ہے
یہ شانِ خسروی تیری ، یہ حسنِ آگہی تیرا
پسندِ خاطرِ اہلِ بصیرت ہے زمانے میں
نگاہِ بے ریا تیری، وقارِ بندگی تیرا
گدازِ فکر و سوزِ دل وہاں جوہر دکھاتا ہے
جھلکتا ہے جہاں بھی جذبۂ عشقِ نبی ﷺ تیرا
وفا کے راستے کو جگمگائے گا قیامت تک
طریقِ رہروی تیرا، شعورِ رہبری تیرا
عملِ پیہم محبت فاتحِ عالم ترا مسلک
متاعِ حریت رنگِ مذاقِ زندگی تیرا
یقیں کس طرح اب تیری بلندی کا کیا جائے؟
کہ دنیا میں نہیں پیدا ہوا ہے قد ابھی تیرا
فرنگی ہوں کہ روسی ہوں و افغانی کہ تاتاری
ادب کرتے ہیں دل سے شاعرِ مشرق سبھی تیرا
منوّر شانؔ کا دل کیوں نہ ہو حسنِ عقیدت سے
کہ ہے ذوقِ سخن پر اس کے احساں واقعی تیرا

(علامہ اقبالؔ کے نام ایک چٹھی)

محمد صلاح الدین پرویزؔ

سوچ رہا تھا کہ کیا لکھوں
تجھ کو لکھوں تو کیا لکھوں
کارِ جہاں دراز ہے، تیرا خیال آ گیا کوئے جمال
چھٹ گیا، دشتِ ملال آ گیا
اقدس و قرطبہ نہیں منبر پہ مصطفی ﷺ نہیں
سجدے میں خون مل گیا
کوفے میں ہند ڈھل گیا
وقتِ زوال دیکھ کے مجھ کو تو حال آ گیا
تیرے زمین عشق میں
بندے بہت ہیں دل ہیں کم
چہرے بہت ہیں، تل ہیں کم
آنکھیں بہت ہیں، شب ہے کم
سجدے بہت ہیں، رب ہے کم
بھیگ رہی ہیں ساعتیں
جلنے لگیں ندامتیں

گرد و غبار بھی نہیں
رت بھی شرار بھی نہیں
بدر و حنین بھی نہیں
زینبؓ، حسینؓ بھی نہیں
راز بہت ہیں بخت کم
ساز بہت ہیں، رفت کم
تاج بہت ہیں تخت کم
کام بہت ہیں، وقت کم
سینے بہت ہیں، وار کم
شہر بہت ہیں، یار کم
وہ کون تھی کہ جس کا سر گنبد تھا؟
ہاتھ تھے مینار، منبر تھا دل، رکوع کمر
آنکھیں تھیں حوضِ پارسا
پیاسوں کو زمزم آب جو
اس کو کسی نے کل کی تب۔۔
آگے لکھوں تو کیا لکھوں؟
احوالِ دیگراں ہے یہ
بالکل ہی ٹھیک ٹھاک ہوں
کیا تو بھی ٹھیک ٹھاک ہے؟

(ماخوذ از دشتِ تحیرات)

آہ اقبال

واحد پریمیؔ

ایک انساں
کہ جس کی فطرت پر
آدمیت نثار ہوتی تھی۔
ایک رہبر
کہ جس کے نقشِ قدم
مشعل شاہراہ ہوتے تھے۔
اک مقرر
کہ جس کی ہر اک بات
ذہن و دل کو جھنجوڑ دیتی تھی۔
اک مفکّر
کہ جس کی فکرِ بلند
ساتویں آسماں کو چھوتی تھی۔
ایک شاعر کہ جس کا ہر اک شعر
ترجمانِ حیات ہوتا تھا۔
یعنی اقبالؒ باصفات نہیں
ماہرِ نبضِ کائنات نہیں۔

گلزارِ خودی

معین الدین بزمیؔ

آہ اے اقبال آتی ہے تری یاد آج بھی
سونے والوں کو جگاتی ہے تری یاد آج بھی
موجزن فکرو نظر میں رنگ و نورِ سرمدی
ہے ترے ہر شعر میں پنہاں سرورِ سرمدی
نغمۂ فطرت، نوائے سینۂ روح الامیں
تیرا دل تھا پردۂ سازِ حقیقت آفریں
تیری ہر اک سانس تھی مضرابِ سازِ زندگی
ہے ترے ہر شعر میں پوشیدہ رازِ زندگی
وسعتِ افکار کو رنگیں فضائیں بخش دیں
زندگی کو مسکرانے کی ادائیں بخش دیں
تیری نغمہ باریوں سے جھوم اٹھے دشت و جبل
قوم کی رگ رگ میں دوڑی گرمئ عزمِ عمل
شہپرِ پروازِ آزادی، عقابِ حریت
ظلمتوں میں نور افشاں، آفتابِ حریت
تو نے کھولا ہے یہ رازِ ارتقائے کائنات
ہے فقط حاصل زمانہ میں تغیر کو ثبات
تو نے پھونکی ہم میں روحِ انقلابِ زندگی
موجزن ہے آج رگ رگ میں شرابِ زندگی

کتنے نغموں سے ہوا معمور تیرے دل کا ساز
دردؔ کا انداز تجھ میں، میرؔ کا سوز و گداز
وسعتوں میں فکرِ غالبؔ کو پرُ افشاں کردیا
داغؔ کو دی وہ جِلا ، مہرِ درخشاں کردیا
داستانِ عالمِ نو، تیرے دل کی داستاں
ہے رواں بانگِ درا پر زندگی کا کارواں
یہ رموزِ بے خودی، وہ رنگِ اسرارِ خودی
لہلہا اٹھا ترے نغموں سے گلزارِ خودی
شاعرِ مشرق، یہ تیرا زورِ بالِ جبرئیل
دہر کے آتش کدے میں جیسے گلزارِ خلیلؑ
اللہ اللہ، یہ ادائے قوتِ ضربِ کلیمؑ
ہوگیا پیدا مزاجِ عشق میں ذوقِ سلیم
تونے چھیڑا جھوم کر جب نغمۂ سازِ عجم
زندگی میں آگیا اک کیف پرور زیر و بم
زندۂ جاوید ہے جاوید نامہ بھی ترا
کس قدر ہے کاشفِ اسرار خامہ بھی ترا
کھول کر اسرارِ فطرت کے خزانے رکھ دیے
گیسوئے اردو پہ تونے کتنے شانے رکھ دیے

تیرے روشن کارنامے کیا حیات افروز ہیں
روشنی میں جن کی ہم سب ارتقاء آموز ہیں
دیکھ اے اپنی صدی کے حافظؔ و خیامؔ دیکھ
کتنے شاعر پی رہے ہیں آج تیرا جام دیکھ
درد سے انسانیت کے بےخود و سرشار ہوں
میں بھی تیرے مئے کدے کا ایک بادہ خوار ہوں

فخرِ ایشیاء

ظہیرؔ

ہم نشینو! کیا بتاؤں تم سے کیا اقبالؒ تھا
فکر و فن کی انجمن کا آئینہ اقبالؒ تھا

آبروئے حسنِ الفاظ و نوا اقبالؒ تھا
کعبۂ فکر و تجسس کا خدا اقبالؒ تھا

جتنا ہم سمجھے ہیں کچھ اس سے سوا اقبالؒ تھا
زمرۂ آفاق میں بانگِ درا اقبالؒ تھا

فلسفیٔ دین و دنیا، رہبرِ علم و ادب
پاسبانِ قوم، ملت آشنا اقبالؒ تھا

تھے مشیّت کے تقاضے اس کی جاگیرِ نظر
دہر میں خیر و اُخوّت کی صدا اقبالؒ تھا

خواب بن سکتا نہیں شاہین ہستی کا خیال
دیدہ ور مردِ مجاہد، رہنما اقبالؒ تھا

مردِ مومن کا تصور رہنمائے زندگی
لوحِ نطق و لب پہ لفظِ پارسا اقبالؒ تھا

نظریے میں تھا وہ قدرِ مشترک کا دادخواہ
فن کے آئینوں میں جمہور آشنا اقبالؔ تھا
اک یقین و عزم کا پیغام ہر حرف و نوا
سچ تو یہ ہے مردِ کامل کی صدا اقبالؔ تھا
منہدم جس عہد میں تہذیب کا گھر تھا بہت
فخرِ ادراک و فروغ و ارتقاء اقبالؔ تھا
ٹوٹتی اقدار کے نوحے پڑھے جاتے تھے جب
سرخوشی و آگہی کا ماجرا اقبالؔ تھا
لے کے آیا تھا وہ ایسا مرہمِ آواز و صوت
ہر جگہ زخمی دلوں کا آسرا اقبالؔ تھا
وقت کے رخ پر ردا تھی نخوت و تحقیر کی
اور اخلاص و محبت کی ادا اقبالؔ تھا
عزمِ محکم ہی سے ٹوٹا ، ظلمتِ شب کا طِلسم
ہر اندھیرے میں اجالے کی دعا اقبالؔ تھا
لب پہ اس کے آنہ پاتی تھی کبھی زخموں کی بات
ہر تنِ نازک پہ شبنم کی رِدا اقبالؔ تھا
اس جہاں میں عظمتِ انسانیت کا قدرداں
شاعرِ بے باک، پندار آشنا اقبالؔ تھا

ہر نگارِ زندگی کا عکس اس کے شعر میں
پیکرانِ حرف و معنی کی رِدا اقبالؔ تھا
وہ فلک پیما کبھی تھک کر کہیں بیٹھا نہیں
کائناتِ بے کراں میں بھی سِوا اقبالؔ تھا
حق نِگر ، بے باک، خود آگاہ اور روشن دماغ
مختصر یہ ہے حقیقت آشنا اقبالؔ تھا
اس کی اک اک بات دل پر نقش ہو کر رہ گئی
دہر میں حرفِ خودی کا ارتقاء اقبالؔ تھا
کون اسے میری طرح پہچان سکتا ہے ظہیرؔ
اپنے اندر بھی تو صدیوں کی صدا اقبالؔ تھا

نذرِ عقیدت بہ حضورِ حکیمِ مشرق علامہ اقبالؔ

ضیاءبانیؔ

کشورِ شعرو ادب پر حکمرانی جس نے کی
ایشیاء کے دردِ دل کی ترجمانی جس نے کی
شرق سے تا غرب جس کی شاعری کی دھوم ہے
شاعرانہ جس کی عظمت آپ کو معلوم ہے
جو وطن کا تھا حقیقی شاعرِ جادو بیاں
کر رہی ہے ناز جس پر آج بھی اردو زباں
آنے والے دور کا آئینہ ہے جس کا کلام
جلوہ فرما جس میں مستقبل کا جمہوری نظام
کم نہیں تیغِ سلف سے جس کی شمشیرِ زباں
نقش ہر دل پر سوا ہے جس کا اندازِ بیاں
جس کی ذات ِبے بہا میں تھیں ہزاروں خوبیاں
روپ میں جو تھا قلندر، اور خدا کا راز داں
جس کی اک اک نظم میں پنہاں خودی کا راز ہے
جس کے اعجازِ سخن پر ایشیاء کو ناز ہے
جس نے اسرارِ معرف کا کیا ہے انکشاف
گفتگو کی جس نے شکوے میں خدا سے صاف صاف

راز جس نے فاش پستی اور ذِلت کا کیا
مردِ مومن اپنے ہونے کا نشاں جس نے دیا
جو بظاہر ہے نگاہِ اہلِ دنیا سے نہاں
ہوگئی حاصل اسے لیکن حیاتِ جاوداں
جان و دل سے ہم نہ کیوں اس پر کریں سب کچھ نثار
کیوں نہ ہم قائم کریں اک غیرفانی یادگار

جس نے زندانِ غلامی سے نکالا آپ کو
منزلِ مقصود کا رستہ دکھایا آپ کو
خودشناسی کا سبق ہر فرد کو جس نے دیا
فلسفہ مرنے کا بھی ، جینے کا بھی واضح کیا
جس نے رکھ دی کھینچ کر اشعار میں تصویرِ قوم
جس کے نغموں نے بدل دی ہند میں تقدیرِ قوم
جس نے بنیادیں ہلا دیں قصرِ استبداد کی
کی حمایت جس نے ہر مظلوم کی، ناشاد کی
ایشیاء تو ایشیاء، یوروپ ہے جس کا قدرداں
اپنا تو اپنا، پرایا بھی ہے جس کا مدح خواں
جشنِ صد سالہ اسی مِشرق کے شاعر کا ہے آج
پیش کرتا ہے حما حسنِ عقیدت کا خراج

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبالؒ توشیحی نظم

متینؔ اچلپوری

ڈرا رہا تھا اندھیرا تمام ملّت کو
لگا تھا دھڑکا عجب صبح شام ملّت کو
ادائے خاص سے امید کی کرن جاگی
تڑپ کے جاگ اُٹھا شاہین، کاہلی بھاگی
کرم ہوا کہ سفر کا تجھے خیال آیا
مثالی راہ گزر کا تجھے خیال آیا
ٹھٹھر گئے تھے عجب بال و پر، کھلے آخر
صدی کے داغ تھے، لمحوں میں جو دھُلے آخر
رکاب کو کفِ پا مل گئے ، لگام کو ہاتھ
ہوا میں اُڑنے لگا اسپ آن بان کے ساتھ
سلامتی کے لئے ہے جہادِ سیفِ قلم
ہٹے نہ پیچھے ، بڑھائے جو روشنی نے قدم
رہِ وفا میں سفر کا یہی قرینہ ہے
یہاں تو آبلہ پلکوں کا آبگینہ ہے
شرابِ کہنہ پیالوں میں بھرنے والا تو
یہ کارِ خیر بہر طور کرنے والا تو
یہ کج کلاہی تری، راہِ مستقیم میں ہے
خلوصِ فکر عجب شیوۂ عظیم میں ہے

خدا نے تجھ سے لیا کام ایسا انہونا
حرام جس کے تئیں ہے ضمیر کا سونا
مدام چلنے کا درس عجب دیا تونے
تجلّی بار چراغِ ادب دیا تونے
حریفِ کوچۂ مغرب، رفیقِ کوچۂ شرق
شعاعِ فکر کو تونے عطا کی جرأتِ برق
مکالماتِ خرد کا طلسم توڑ دیا
نگاہ کو دی بصیرت، دلوں کو جوڑ دیا
مزاجِ ملّتِ شاہِ عرب ﷺ بدل کے رہا
مثالی فرد کے سانچے میں خواب ڈھل کے رہا
دل و نگاہ کی خاطر بصیرتیں کیا کیا
تری نگاہ سے چمکی ہیں سیرتیں کیا کیا
افق افق ترے پیغام کی ضیاء پہنچی
یہی تڑپ تو تجھے لے کے قرطبہ پہنچی
قلم نے تیرے بڑا کام کرکے چھوڑا ہے
تری فقیری نے شاہوں کو بھی جھنجھوڑا ہے
اثر دکھایا فغاں نے، دعا نے کام کیا
شرابِ کہنہ کو ساقی نے نذرِ جام کیا
لباسِ فقر، جمال و جلال تک پہنچا
صدف میں قطرۂ نیساں کمال تک پہنچا

اقبالؒ

توقیر احمد، (اسلام آباد، پاکستان)

مفکّر وہ، مصّور بھی وہ، بے پایاں سُخن ور تھا
خودی میں، عشقِ نبوی ﷺ میں، نہ کوئی اس کا ہمسر تھا
نگاہیں اس کی رکھتی تھیں سیاست میں بصیرت بھی
کہ جو قائد چُنا اُس نے، وہ اک نایاب گوہر تھا

فکرِ اقبالؒ

اشتیاق احمد یادؔ، کراچی

فکرِ اقبالؒ سے دھرتی کو بدلنا ہوگا
خود کو خود دار بنا کر ہی سنبھلنا ہوگا
درسِ اقبالؒ ہے افکار کی تشکیل جدید
مِل کے ہم سب کو اسی راہ پہ چلنا ہوگا

اقبالؔ اور فرشتے

نوید رزّاق بٹ لاہوری (سویڈن)

وہ دوَر آیا ؟ نہیں ابھی تک
نظام بدلا ؟ نہیں ابھی تک
وہ کاخِ اُمراء؟ ہلی نہیں ہے
غریب جاگا؟ نہیں ابھی تک
وہ میرا شاہیں؟ بے بال و پر ہے
پلٹ کے جھپٹا؟ نہیں ابھی تک
وہ مردِ مومن ؟ گُماں کا مارا
یقین پیدا ؟ نہیں ابھی تک
غلام یٰسیں؟ ہزار ہا ہیں
وہ کُفر ٹوٹا؟ نہیں ابھی تک
خدا کے عاشق؟ بَنوں میں رقصاں
شِعارِ عیسیٰؑ؟ نہیں ابھی تک
فریبِ آتش؟ قدم قدم پر
خلیلؑ کودا ؟ نہیں ابھی تک
تجلیِ حق ؟ ہر ایک دل پر
کلیمؑ تڑپا ؟ نہیں ابھی تک
خودی کی رفعت؟ بشر نہ جانا
رضائے بندہ؟ نہیں ابھی تک
کلام میرا ؟ لبوں کی زینت
مرید سمجھا ؟ نہیں ابھی تک

وصایا : اقبالؔ

نوید رزّاق بٹ لاہوری

نَوِشتۂ رُخِ بشر
نویدِ راہِ بے گَراں

عذابِ فکر و آگہی
عذاب وہ کہ الاماں

نگاہِ شوق، مضطرب
حجابِ ہوش، درمیاں

سکونِ قلب ، ذِکرِ
غفور و عفو و مہرباں

اَنا، شہیدِ مرگِ دل
خودی،حیاتِ جاوداں

رہینِ ذات، ضَو بجیب
ندیمِ خلق، ضَو فشاں

یومِ اقبالؒ

خان حسنین عاقبؔ

۱

چلو! قلم کو عبادتوں کا مزہ چکھائیں
جدید لہجے کے شاعروں کو
روایتوں کا مزہ چکھائیں
انہیں بتائیں اسی افق پر
شہِ سخن بھی براجماں تھا
وہ اپنا اقبالؒ جو کہ مِلت کا ترجماں تھا
مگر نہ جانے وہ کتنے لوگوں سے مختلف تھا
وہ عہدِ رفتہ کی عظمتوں کا بھی معترف تھا
وہ عہدِ حاضر کی ساری چالاکیوں کا شاکی
تھا اس کا ایماں کہ اصل انساں تو بس ہے خاکی
نظر میں اس کی تھا عشق و مستی کا سلسلہ بھی
اسے مسلماں کی کور ذوقی سے تھا گِلہ بھی
سکھائے اس نے قلم کو اپنے
طریقے رقصِ متاعِ جاں کے
اسی نے سمجھائے راز ہم کو
خودی کے، خود کے، خدا کے، اسرارِ دو جہاں کے
اسے جمیعت کا والہانہ خیال بھی تھا
اسے مسلماں کی پارہ پارہ عقیدتوں کا ملال بھی تھا

اسے پتا تھا خیال کیا ہے؟
اسے پتا تھا کہ حال کیا ہے
اسے زمانوں کی پیش بینی کا شوق بھی تھا
اسے تو احیائے عظمتِ رفتہ کی تلاش اور جستجو کا
یقین بھی اور ذوق بھی تھا
زمیں کو اس نے فلک کی آغوش میں بٹھایا
نوائے اقبالؔ نے مسلماں کو گہری نیندوں سے پھر جگایا

۲

بہت محبت ہے دل میں اس کی
بہت عقیدت ہے دل میں اس کی
چلو، ہم اس کا کلام گائیں
چلو کہ اس بار بھی ہمیشہ کی طرح
اقبالؔ ڈے منائیں
چلو، ادیبوں کی ایک مجلس
اسی کو منسوب کیوں نہ کر دیں؟
اگر ہو ممکن، مشاعروں کا کوئی تماشہ بھی
نذرِ محبوب کیوں نہ کر دیں؟
اگر ہو ممکن، حیات پر اس کی فلم ہی
کیوں نہ ہم بنا دیں؟
چلو تقاضہ کریں یہ دنیا سے

اس کو بخشے یہ نوبل انعام
اسے دلائیں زمانے بھر سے ہزار اکرام
اسی کے دم پر معلموں کے گروہ روزی کما رہے ہیں
ہزارہا اس کے نام پر کاروبار اپنے چلا رہے ہیں
تو جمع کرلیں انہیں، دکھا کرنئی امیدوں کے وا در یچے؟
کہ ساتھ لے کر انہیں لگائیں نئے رواجوں کے اونچے نعرے؟

۳

مگر اسے اس سے کوئی شائد خوشی نہ ہوگی
نہیں! کہ ہرگز خوشی نہ ہوگی، کبھی نہ ہوگی
وہ شخص تو تھا عمل کا جویا
عمل کی خاطر وہ کتنا رویا
اسے مسلماں کی خستہ حالی پہ تھی کڑھن بھی
شعور جس پہ تھا اس کا غمگیں، ملول مَن بھی
وہ ایک بندہ تھی منکشف جس پہ رمزِ 'کُن' کی ہر اک حقیقت
وہ ایک شاعر جسے خودی کے نگارخانوں سے تھی عقیدت
جہاں مسلماں کی، پستیوں پر ہی بس نظر تھی
اسے بلندی یقینِ دل کی عزیز تر تھی
تھا جب مسلماں کے فکر و ایماں پہ کاہلوں سا جمود طاری
عصائے شعر و ہنر نے اس کے لگائی ذہنوں پہ ضربِ کاری
اسے یقیناً تکلف و رسمِ دل ناگوار ہوگی

۴

سنو بزرگو، سنو جوانو!

چلو ہم ایسا کریں کہ اس کے

ہر اک تصور کو عام کردیں

نظر میں اس کے تھی جو حقیقت

اسی حقیقت کا ہم بھی قائم نظام کردیں

اسے شریعت کی جستجو تھی

اسے حقیقت کی آرزو تھی

چلو ہم ایسا کریں کہ اِس دَم

خود اپنے اعمال کی خبر لیں

خدا کی رسی کو کس کے دھر لیں

خود اپنی فکروں کو چُست کرلیں

صفیں جو اپنی ہیں منتشر

ان صفوں کو ہم سب درست کرلیں

ہمارا ایماں رہے سلامت

ہمیں ہو حاصل نبی کی چاہت

چلو کہ تبدیلیوں کی ایسی ہوا چلائیں

کہ عشق بیز و خیال آور ہوں یہ فضائیں

ہر ایک مسلمِ جوان اقبالؔ کا اگر ہم مزاج ہوگا،

اسے ہمارا یہی حقیقی خراج ہوگا۔

تاثراتِ

اکابرینِ وقت

اقبالؔ بہ چشمِ سیاست

موہن داس کرم چند گاندھی

ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں میں کیا لکھوں؟ لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی نظم 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' پڑھی تو میرا دل بھر آیا۔ اور یار ودہ (یروڈا) جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے۔ اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

موہن داس کرم چند گاندھی۔ ۹، جون ۱۹۳۸

محمد علی جناح

بھارت کے دستوری مسائل کے محتاط مطالعے اور تجربے کے دوران اقبالؔ کے خیالات نے بالآخر مجھے انہی نتائج پر پہنچا دیا جن پر اقبالؔ خود پہنچے تھے۔

مجھے اس امر کا فخر حاصل ہے کہ اقبالؔ کی قیادت میں مجھے ایک سپاہی کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع مل چکا ہے۔ میں نے ان سے زیادہ وفادار رفیق اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔

1929 سے میرے اور سر محمد اقبالؔ کے نظریات میں ہم آہنگی ہوئی۔ اور وہی ایک عظیم اور اہم مسلمان تھے جنہوں نے ہر مرحلے پر میری حوصلہ افزائی کی اور آخری دم تک میرے ساتھ مضبوطی سے کھڑے رہے۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

ڈاکٹر اقبال اپنی وفات سے ہمارے ادب میں ایسی جگہ خالی کر گئے جس کا گھاؤ مدت مدید میں بھی مندمل نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان کا رتبہ آج دنیا کی نگاہ میں اتنا کم مایہ ہے کہ ہم کسی حالت میں ایسے شاعر کی کمی برداشت نہیں کر سکتے۔ جن کے کلام نے عالم گیر مقبولیت حاصل کر لی تھی۔

ڈاکٹر سر اکبر حیدری

(صدرِ اعظم، حکومتِ دولتِ آصفیہ)

اقبال نے ساری دنیا کے لیے ایک نیا پیام دیا ہے۔ اس کی شاعری بنی نوع انسان کے لیے نویدِ عمل و کامیابی ہے۔ بالخصوص موجودہ زمانے میں نونہالانِ ملک کے لیے اس کی عزم افزا نغمہ اس قدر موزوں ہے کہ جس قدر بھی اس کی اشاعت و تبلیغ کی جائے، کم ہے۔

سر تیج بہادر سپرُو

جو چیز اقبال کو اکثر شاعروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ ان کی دقتِ خیال اور وسعتِ نظری ہے۔ ان کی شاعری محض رونے اور جذبات کے اظہار کا ذریعہ نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی ذہانت اور پروازِ فکر کو اس میں ضائع نہیں کیا کہ کسی متلون مزاج معشوق کے ناز و انداز کے مطالعہ میں سرگرداں رہیں۔ بلکہ وہ فطرتِ انسانی کے اعلیٰ، برتر، لطیف جذبات و احساسات کے ترجمان تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک بہت بڑے فلسفی تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ صرف عقلیت ہی انسانیت کی ترقی کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے انہوں نے اپنی ساری اردو اور فارسی شاعری میں انسانی زندگی کے روحانی پہلو پر بہت زور دیا ہے۔ وہ مشرق و مغرب کے فلسفے پر چونکہ عبور رکھتے تھے اور جذباتِ انسانی کے تاروں کو لطیف انداز میں چھیڑنے کا گر اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی شاعری کی تفسیر میرے نزدیک یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کے وہ مسائل جو بظاہر ناقابلِ حل معلوم ہوتے تھے، عقل کے ذریعے نہیں بلکہ حقیقی اور سچی محبت کے ذریعے حل کئے ہیں۔ شعرائے متقدمین اور موخرین میں سے میرؔ و غالبؔ کے سوا کسی کا ان سے کوئی مقابلہ نہیں۔ ان کی راہ سب سے الگ تھی، ان کا میدان سب سے جدا تھا۔ اس میں ان کا کوئی ہم عصر نہ تھا۔

ڈاکٹر راجندر پرساد

(آزاد ہندوستان کے پہلے صدرِ جمہوریہ)

ڈاکٹر اقبال نے اپنے اشعار سے ہندوستان میں نئی روح پھونک دی اور ان کے شعر کچھ اتنے ہر دل عزیز ہو گئے ہیں کہ ہندوستان کے سبھی حصوں میں گائے اور پڑھے جاتے ہیں۔ ان کی سیاست سے لوگوں کو تفرقہ ہو سکتا تھا مگر جو جذبات انہوں نے اپنے اشعار میں ظاہر کئے ہیں اور جو بیداری انہوں نے اپنی شاعری سے پیدا کی ہے، اس میں کسی کو کسی طرح کا عذر نہیں ہو سکتا۔

جب آج کی بہت پریشان کن مشکلات طے ہو جائیں گی اور آج کی بہت سی باتیں لوگ بھول جائیں گے، اس وقت سر محمد اقبال کے اشعار ہندوستان کو جگاتے رہیں گے۔

اقبالؒ بہ چشمِ مذہب

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

مغربی تعلیم وتہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ (اقبال) جتنا مسلمان تھا اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اُترتا گیا، اتنا ہی مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گُم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فطری وجود باقی ہی نہیں۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا، قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا، جو کچھ دیکھتا تھا، قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کے نزدیک شئے واحد تھے۔ اور اس شئے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس کے دَور کے علمائے دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی القرآن میں اس امامِ فلسفہ اور اس ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، بار۔ایٹ لاء سے لگّا کھاتا ہو۔ وہ سالہا سال تک علوم وفنون کے دفتروں میں غرق رہنے کے بعد جس نتیجے پر پہنچے تھے وہ یہ تھا کہ اصل علم قرآن ہے اور یہ جس کے ہاتھ آجائے، وہ دنیا کی تمام کتابوں سے بے نیاز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ سے ان کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے مگر یہ شائد کسی کو نہیں معلوم کہ انہوں نے اپنے سارے تفلسف اور اپنی تمام عقلیت کو رسولِ عربی ﷺ کے قدموں میں ایک متاعِ حقیر کی طرح نذر کر کے رکھ دیا تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی

دنیا سے اُٹھ جانے کے باوجود راہ نمائی اقبالؒ سے طلب کی جائے گی۔

خواجہ حسن نظامی

جسم پنجابی، دماغ فلسفی، خیال صوفی، دل مسلمان۔

عبدالماجد دریابادی

خدا آپ حضرات کو توفیق دے کہ آپ اقبال کے اصلی مقام کو پہچانیں اور کلامِ اقبال کو ابتدائی دور کو چھوڑ کر اس کے وسطی اور آخری حصوں کو پڑھ کر اس کی روح و مغز تک پہنچیں۔مولانائے روم کا اسم شاعری کے دیوان میں لکھ لیا گیا۔لیکن دنیا جانتی ہے کہ مثنوی کی معنویت کو مشاعرہ والی شاعری سے بھلا کیا نسبت ہے؟ بس یہی صورت اقبال کے لیے ہے۔وہ باوجود اتنا بڑا اور مشہور شاعر ہونے کے، شاعر نہیں ہے۔بلکہ اپنے پیام سے مقامِ نبوت کی جانشینی کا حق ادا کر رہا ہے۔مبارک ہیں وہ ہستیاں جو اقبال شناس ہو جائیں۔

مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی

زندگی کے طویل تر دور میں دماغ پر علامہ اقبالؔ کا بڑا غلبہ رہا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی معاصر شخصیت کے افکار کا اتنا گہرا اثر دماغ پر نہیں پڑا جتنا علامہ اقبالؔ کے کلام کا۔

اقبالؔ کو میں نے اولو العزمی اور ایمان کا نوحہ خواں شاعر پایا۔جب بھی میں نے ان کا کلام پڑھا تو دل سے جوش اُمڈنے لگا اور لطیف جذبات نے انگڑائیاں لینی شروع کر دیں۔احساسات و کیفیات کی لہریں بیدار ہونے لگیں اور رگوں میں شجاعتِ اسلامی کی روح دوڑنے لگی۔

اقبالؔ کی آہِ سحر گاہی اس کا اصل سر چشمہ ہے۔جب سارا عالم خوابِ غفلت میں پڑا سوتا رہا، اُس اخیر شب میں اقبال کا اُٹھنا اور اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا، پھر گڑ گڑانا اور رونا، یہی چیز تھی جو اس کی روح کو ایک نیا نشاطِ قلب اور نئی روشنی اور ذہن کو فکری غذا عطا کرتی ہے۔اقبالؔ کی فنی مہارت و چابکدستی اور بلیغ منظر کشی و سماں بندی کہ حالات و واقعات کی تصویر نگاہوں میں پھر جائے، اور قال، حال اور جنت نظیر بن جائے۔

اقبالؔ اپنی تدریسی دقیقہ سنجی، درون بینی اور بالغ نظری سے ملکوں، تہذیبوں، مذہبوں اور قوموں کی روح میں اُتر جاتے ہیں۔اور پھر اپنا ذاتی مشاہدہ اور صداقت کا تجربہ و تجزیہ، شعر و نغمہ کے پردوں کی آڑ میں ہو بہو سامنے رکھ دیتے ہیں۔

نعیم صدیقی

وہ قوت جسے مذہب قرار دے کر شعروفن کی محفلوں سے نکال دیا گیا تھا، اسے اقبالؔ ایک پُرعظمت تحریک کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے کر ایوانِ سُخن میں داخل ہوئے۔

اقبالؔ نے دلوں اور دماغوں پر بہت ہی گہرا اثر اس لئے ڈالا کہ ملت نے اپنے سفرِ جستجو میں اس کے شعلۂ نوا کو بہترین قندیل پایا ہے۔ان کے یہاں ہمیں اپنی بکھری ہوئی ہستی کا سُراغ ملتا ہے۔ہم کیا تھے؟ ہم کیا ہو گئے؟ ہمیں کیا ہونا چاہیے؟ کون سے عقائد وتصورات ہمارے لئے روح کی حیثیت رکھتے ہیں؟ ہمارا ڈھانچہ کن اصولوں، قدروں اور روایتوں سے بنتا ہے؟ ہماری زندگیوں کا اعلیٰ ترین مشن کیا ہے؟ ہمارے انسانِ مطلوب کے خدوخال کیا ہیں؟ ان سوالوں کا اقبالؔ کے یہاں واضح جواب ملتا ہے۔یا کم ازکم جواب تک پہنچنے کے لئے واضح اشارے ملتے ہیں۔
اقبالؔ نے اسلام کی روشن صداقتوں کو شعر میں اس شان سے سمویا کہ شعریت کو کوئی ضعف نہیں پہنچا بلکہ شعریت اور زبان نکھر گئی۔ فن کے ناوک اور زیادہ نوکیلے ہوکر دلوں میں ترازو ہو گئے۔

مریم جمیلہ

اقبالؔ کی'اسرارِ خودی' کے انگریزی ترجمے کے باوجود میں نے اُسے مسحور کُن پایا۔بہت سے شاعر جو مختلف ثقافتوں اور زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی شاعری کا محور صرف قدرت کی خوبصورتی اور عاشقانہ محبت ہوتی ہے ۔اقبالؔ وہ شاعر ہیں جس کی شاعری اسلام کی محبت کے گرد گھومتی ہے۔ایک معروف کہاوت ہے کہ آرٹ اور پروپیگنڈا کبھی مل نہیں سکتے۔لیکن اقبالؔ جیسے ذہین شخص نے اس کہاوت کو غلط ثابت کر دیا۔اقبالؔ ان بہت تھوڑے لوگوں میں شامل ہیں جن کی شاعری ناصحانہ ہونے کے باوجود خوبصورتی نہیں کھوتی۔

اقبالؒ بہ چشمِ احباب

فقیر سید وحید الدین

اقبالؒ کی شخصیت بہت عظیم المرتبت تھی لیکن ان کی ذاتی زندگی قلندر اور مردِ درویش کے مانند تھی۔ سیدھی سادی معاشرت، کوئی تصنع نہیں، کسی قسم کا کرّ وفر نہیں۔ مکان کے در و دیوار آرائش سے عاری۔ ہر شخص ان تک بغیر کسی دشواری کے پہنچ سکتا تھا۔ آرائش اور نمائش کی طرف ان کی نظر ہی نہیں جاتی تھی۔ ان کی زندگی ایک صابر اور متوکّل مسلمان کی زندگی اور ان کا عمل ان کی فکر و نظر کا نمونہ تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

اقبالؒ، جدید دانش اور قدیم حکمت کا نقطۂ معراج۔ چونکہ میاں (حضورِ اکرم ﷺ) سے محبت رکھتے تھے اس لئے اللہ نے ان پر علم و دانش اور فکر و نظر کی راہیں کھول دیں۔

سر شیخ عبد القادر

جوں جوں ان کا مطالعہ، علم و فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا، تو انہوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلے میں اردو کا سرمایہ بہت کم ہے اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں کہ جن کے مطابق اردو میں فقرے ڈھالنا آسان نہیں۔ اس لئے وہ فارسی کی طرف راغب ہو گئے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق

اقبال کی شاعری کی خاص غایت تھی۔مولانا حالی کی طرح اقبال نے بھی اپنی شاعری سے قوم اور ملک کے جگانے اور رہ نمائی کرنے کا کام لیا۔یہ اس کے خیال اور فکر کی قوت اور جدت تھی جس نے اس کے کلام اور طرزِ بیان میں جوش پیدا کر دیا تھا۔اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں سارے ملک میں چھا گیا تھا۔اگرچہ اس نے اپنے شعر میں ہمیشہ عقل سے نفرت اور جنوں سے رغبت پیدا کرنے کی ہدایت کی،لیکن اس کی ہر نظم عقل و حکمت پر مبنی تھی۔اس نے ہمیں آزادیٔ فکر اور خود اعتمادی سکھائی۔اور ایسے توہمات کو توڑا جو گھن کی طرح ہماری قوم کو اندر ہی اندر کھائے جارہے تھے۔اس کا کلام اردو زبان میں ہمیشہ زندہ رہے گا کیونکہ اس نے مردہ دلوں کو زندہ کیا ہے۔

سید نذیر نیازی

اقبالؒ کی فکر بھی ایک طرح کا عمل ہے۔اور اگر عمل کے معنی ہیں نصب العین کے لئے ترغیبات تو حضرت علامہ کسی صاحبِ عمل سے پیچھے نہیں تھے۔

محفل میں حضرتِ اقبالؒ کی گفتگو معمولی سے معمولی مسائل،واقعات اور حوادث سے پھیلتے پھیلتے اسلام،عالم اسلام،تاریخ،تمدّن،سیاست اور معیشت،سب پر چھا جاتی۔انسان،کائنات،عمل و عقل،فکر و وجدان،ادب اور فن،سب اس کی زد میں ہوتے۔اس پر حضرتِ علامہ کا حُسنِ بیان،صاف و سادہ اور دل نشین الفاظ،فصاحت و بلاغت،برجستگی اور بے ساختگی،توجہ اور التفات،شفقت اور تواضع،خلوص اور دردمندی،کہ جو ارشاد ہے،دل میں اُتر رہا ہے،ہر بات ذہن میں بیٹھ رہی ہے۔پھر ان کا انکسارِ علم، شگفتگی اور زندہ دلی کہ نہ غرور نہ تمکنت،متانت بھی ہے تو ظرافت کی چاشنی سے خالی نہیں۔حقائق و معارف کی دنیا سامنے ہے۔قلب و نظر کے حجاب اُٹھ رہے ہیں۔دل و دماغ کا رنگ نکھر رہا ہے۔اللہ اکبر!کیا بے تصنع گفتگوئیں اور کیا بے تکلف صحبتیں تھیں۔

غلام رسول مہرؔ

اقبالؒ، انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کے معلم، اسلامی حقائق کا شارح اور اسلام کی آفاقیت کا بہت بڑا داعی ہے۔ وہ ان برگزیدہ اصحابِ فکرونظر میں شامل ہے جن سے قدرت صدیوں بعد عالم انسانیت کو شرف بخشتی ہے۔

عبدالمجید سالکؔ

اقبال نے اردو شاعری کو مریضانہ زارنالوں، حسرت و حرماں اور مایوسی و افتادگی سے نجات دلا کر حیات افروز اور جذبہ انگیز خیالات نظم کرنے پر مجبور کیا۔

اقبالؔ بہ چشمِ معاصرین ومتاخرین
(ادب وفن)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوریؔ

غمِ دوراں کا ایسا نوحہ خواں اور عظمتِ انساں کا ایسا قصیدہ خواں بیسویں صدی میں کوئی شاعر نہیں ہوا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال

اقبالؔ کی روح کی بے تابی، بے چینی اور بے قراری آج بھی اقبالؔ کے راز دانوں کے سینوں میں شعلے کی طرح لپکتی ہے۔

اقبالؔ کی نکتہ آفرینی کے طلسم نے افکار کی گوناگونی سے وحدتِ ایمانی پیدا کی ہے۔ اور ایک ایسی منطق کو جو محض مدرسوں کے طلباء تک محدود تھی، ایک عالمگیر پیغام کی صورت میں دنیا کے سامنے رکھ دیا۔

اقبالؔ مظاہرِ الٰہی میں سے تھے۔ ایسے نابغۂ روزگار خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہدیے کے طور پر ہی انسانوں میں نمودار ہوتے ہیں، آرڈر دے کر نہیں بنوائے جاسکتے۔

اقبالؔ کا بیشتر وقت ایسے معاملات کی نذر ہوتا رہا جو انہیں اور ان کے خاندان کے باقی افراد کو باعزت زندگی گزارنے کے قابل بناسکیں۔ تحقیق وتصنیف کی خاطر فرصت کے لئے وہ تمام عمر ترستے رہے۔ اور شعر، شب بیداری کے عالم میں یا پھر تعطیل کے دنوں میں کہتے تھے۔ بعض اوقات مضامین، سیلاب کی طرح اُمڈ کر آتے اور الفاظ میں ڈھلے ہوئے اشعار کا طوفان بپا ہو جاتا۔ جیسے کسی مچھیرے کے جال میں بہت ساری مچھلیاں آ پھنسی ہوں اور وہ اس کشمکش میں ہو کہ وہ کس کو پکڑے اور کس کو جانے دے۔

قدرت اللہ شہابؔ

اقبالؒ کی شخصیت دراصل ایک کثیر الا ابعاد Multidimentional شخصیت تھی۔عالم اسلام میں وہ اپنی سطح کے پہلے فلسفی اور شاعر تھے جنہیں مشرق و مغرب کے علوم وفنون، فکر وفلسفہ، تاریخ وتمدن کے روایتی اور جدید پہلوؤں پر صرف مطالعہ کے طور پر ہی نہیں بلکہ عملی مشاہدہ کے طور پر بھی بڑا عبور حاصل تھا۔اتنے بڑے سمندر میں خیال اور بیان کی لہریں کسی خاص منظم ترتیب کے ساتھ نہیں اُبھر سکتیں۔

یہ لہریں آڑی ترچھی بھی ہوں گی، متقاطع، متحارب اور معارض بھی ہوں گی۔علامہ کا کمال یہ ہے کہ بھنوروں اور گردابوں کے ان ریلوں میں بھی ان کے فطری بہاؤ کے دو واضح اور متوازن رخ برقرار ہیں۔مادّی دنیا کے معاملات میں وہ بڑی حد تک عملیّت پسند pragmatic ہیں۔یہاں پر ان کی فکر کا رجحان اور اسلوب، اپنے مطالب کو بطور نفس الامر بیان کرتا ہے۔اور یہ نفس الامر یا امر واقعہ کبھی حتمی نہیں ہوتا بلکہ وقت، ماحول اور دیگر عوامل کے ساتھ ادلتا بدلتا بھی رہتا ہے۔لیکن جہاں تک داخلی یا روحانی یا اسلامی افکار و بیان کا تعلق ہے، اقبال کی شاعری اور نثر، دونوں یکساں طور پر مستقیم، مسلسل اور تک رنگ ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی

اقبالؒ کے کلام کی ایک طرح سے بنیادی لَے یا زیریں لہر یہی سوال ہے کہ کائنات میں انسان کا کردار کیا ہے اور کائنات سے انسان کا رشتہ کیا ہے؟ اس کی انہیں بہت فکر ہے اور وہ اس کے بارے میں بہت سوچتے ہیں اور بہت پوچھتے رہتے ہیں۔خود سے بھی، اللہ سے بھی اور تمام لوگوں سے بھی۔خود کائنات سے سوال کرتے ہیں اور غالباً پہلی بار اتنا تجسس، اتنا سوال اور استفسار اردو کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

رشید احمد صدیقی

معلوم ہوتا ہے جیسے شاعری نے اقبالؒ کو اقبالؒ بنانے میں اپنی ساری آزمائشیں ختم کردی ہوں اور ان کے بعد ان پر ساری نعمتیں بھی تمام

کردی ہوں۔ جیسے اردو شاعری کا دین اقبالؒ پر مکمل ہو گیا ہو۔ اس کے باوجود اقبالؒ کی فکر و نظر کی وسعت اور گہرائی کا یہ عالم ہے کہ اس کا بہت کم حصہ ان کے کلام میں منتقل ہوا ہے۔ حرفِ آخر، تقیناً یہ اقبالؒ کی فکر و عمل کا کمال ہے کہ ہر کسی نے گلشن اقبالؒ میں بکھرے رنگوں اور خوشبوؤں کو اپنے ہی انداز سے محسوس کیا اور یوں ہر کسی پر ایک نئی واردات و کیفیت منکشف ہوئی۔ حالانکہ اقبالؒ تو یہی سمجھتے تھے کہ ؎

اقبالؒ بھی اقبالؒ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

این میری شمل

(مشہور جرمن ماہرِ اقبالیات)

مذہب کی تاریخ میں جسے 'پیغمبرانہ انداز کا تجربہ کہا جاتا ہے اقبالؒ اس کی بہترین مثال تھے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

اقبالؒ کو اس بات سے چڑ تھی کہ شاعری یا کوئی اور فن، افادیت و مقصدیت اور زندگی کی تعمیر و تہذیب سے عاری ہو۔

فیض احمد فیضؔ

جہاں تک شاعری میں حساسیت، زبان پر عبور اور غنائیت کا تعلق ہے، ہم تو ان (اقبالؒ) کی خاکِ پا بھی نہیں۔ اگر علامہ سوشلزم کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہو جاتے تو ہمارا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔

شورشؔ کاشمیری

لوگ جوں جوں کلامِ اقبالؒ سمجھتے جائیں گے، ان میں فراتِ زیست سے مردانہ وار گزرنے کا حوصلہ اور صلاحیت پیدا ہوتی جائے گی۔

اقبالؒ کو پاکستان سے محذوف کر دیں تو پاکستان ذہانتِ ملی کے اعتبار سے محض

ایک بیان رہ جاتا ہے۔

اقبالؒ نے روانی و جولانی، ظرافت وسلاست، تجربہ و تمثیل، آواز وطریق، استدلال و اشارات اور تخلیق وفن کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا کہ مجھے ان کے ساحر ہونے کا یقین ہوگیا۔

اقبالؒ نے بلا شبہ کروڑوں انسانوں کو باالواسطہ اور بلا واسطہ متاثر کیا۔ اور شائد پوری تاریخِ انسانی میں اس لحاظ سے اتنا بڑا شاعر کوئی نہیں۔

عرفانؔ صدیقی

اقبالؒ کے ہاں، تاریخ، مذہبی، اساطیری حوالے تلمیحات و استعارے بہت کثرت سے ملتے ہیں۔ اقبالؒ کے سمجھنے کے لئے ہمیں لُغت سے زیادہ انسائکلو پیڈیا کی ضرورت پڑتی ہے۔

اقبالؒ زبان کے بہت بڑے ماہر تھے۔ زبان سے ان کا بڑا اجتہادی رشتہ تھا۔ بلکہ کہیں کہیں تو بڑا باغیانہ رشتہ ہوجاتا ہے۔

عشق کو آپ پُرانے حوالے سے پڑھنا چاہیں گے تو اقبالؒ آپ پر کھُلیں گے ہی نہیں۔ اقبالؒ بہت سے شعری کلیدی الفاظ استعمال کئے لیکن ان میں دوسرا رنگ اور معنویت بھر دی ہے۔ اس معنویت کی تلاش اقبالؒ کی تفہیم میں ایک بڑا کام ہے۔

سید اقبال عظیم

اقبالؒ کو اردو شاعری کی معراج سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ سے کہا جائے کہ تمام شعراء میں سے صرف ایک کا انتخاب کرو تو بلا تامّل اقبالؒ کا دامن تھام لوں گا۔ اس لئے کہ اقبالؒ نے جو کچھ ہمیں دیا ہے، وہ ہمارے پورے سرمایہ شاعری پر بھاری ہے۔

ہارون رشید

اقبالؔ ایک آدمی بھی نہیں، فقط ایک ادارہ بھی نہیں، اقبالؔ ایک حیرت کدہ ہے۔ تاریخ میں جس کی کوئی دوسری نظیر نہیں۔ اس جہاں میں جو داخل ہوا، عمر بھر اسی کا ہو رہا۔

اردو شاعری کے ہاتھ میں بھیک مانگنے کا کشکول ور آواز میں خود ترسی تھی، جب وہ (اقبالؔ) شعر کے اُفق پر اُبھرے۔ امید، ایمان اور عزم کی مشعل تھامے، چالیس برس اس نے اردو ادب کے دھندلے میدانوں کو روشنی سے بھر دیا۔ انسان کی پوری تاریخ میں کوئی شاعر ایسا نہ تھا جس نے سیاسی، لسانی اور فکری اعتبار سے کسی معاشرے کو اتنی گہرائی اور وسعت سے متاثر کیا ہو۔ اردو زبان کے تیور ہی اس نے بدل ڈالے۔ اس کا نسائی لہجہ مردانہ ہو گیا۔

جاوید ہاشمی

دیکھا تو یہی دیکھا کہ جو اقبالؔ کے سحر میں گرفتار ہو جائے، اسے اپنی منزل چرخِ نیلی فام سے پرے نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر صفدر محمود

علامہ سے محبت کے تقاضے پورے کرنے کے لئے فلسفہ، تاریخ و حدیث، عربی، فارسی اور تاریخِ اسلام پر گہری نظر ضروری ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد

اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے فرد کی انفرادیت کو نمایاں کرتے ہوئے اسے ایک ایسا ولولہ عطا کیا جس کے بل بوتے پر وہ سامراج سے ٹکرانے کی ہمت پیدا کر سکتا تھا۔ انہوں نے ماضی کی قوت سے حال کا مقابلہ کرنے کی تدبیر کی۔

خطاب بہ نوجوانانِ اسلام

کبھی اے نوجواں مسلم، تدبر بھی کِیا تو نے وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

تمدّن آفریں، خلّاقِ آئین جہاں داری وہ صحرائے عرب یعنی شُتر بانوں کا گہوارا

سماں الفقر و فخری کا رہا شانِ امارت میں بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے جہاں گیر و جہاں دار و جہاں باں و جہاں آراء

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں مگر تیرے تخیّل سے فزوں تر ہے وہ نظّارا

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیّارا

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شئے تھی نہیں دنیا کے آئین مسلّم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی جو دیکھیں ان کو یوروپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

''غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کُن کہ نورِ دیدہ اش روشن کُند چشمِ زُلیخا را''

کلامِ اقبالؔ

خودی کا سرِ نہاں لا الہٰ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الہٰ الا اللہ

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لا الہٰ الا اللہ

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں، لا الہٰ الا اللہ

یہ مال و دولت دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں، لا الہٰ الا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زُناری
نہ ہے زماں نہ مکاں، لا الہٰ الا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لا الہٰ الا اللہ

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں، لا الہٰ الا اللہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آلباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو تو نوائے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خَم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

طارق کی دعا

یہ غازی، یہ تیرے پراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خون عرب سے
کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انھی کے جگر میں
کشاد در دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دل مرد مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرہ لاتذر ، میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہ مسلماں کو تلوار کر دے!